کہیں کہیں مکتوب نگار کے طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے، اس لئے ان میں قارئین کی دلچسپی کا سامان بھی ہے، اور ان سے فیض صاحب کے سوانح نگار کو بھی مدد ملے گی، مگر زبان و بیان کے معاملہ میں وہ زیادہ محتاط نہیں ہیں اور یہ خطوط تو خود ان کے بقول قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں اور "منھ زبانی" ان کا ترجمہ کیا گیا ہے اس لئے ان کی زبان کی کوتاہی کی ذمہ داری انھوں نے مرزا ظفر الحسن صاحب کے سر ڈالی ہے، اس قسم کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کرلی جائے "اور بہت سی محنت اور تلاش کے بغیر انھیں اردو میں منتقل کرنا محال ہے" (ص۱۲۰) "بہت ہی خوش دل مجمع ہے" (ص۳۵) "جو بھی دوست ہاتھ آئے اسے سلام پہنچا دینا" (ص۳۶) "تمھارے خط پہلے سے زیادہ بشاش معلوم ہوتے ہیں" (۴۹) "میری کوٹھری کی سلاخوں پر دھوپ اور ہوا کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے" (ص۵۶) "آج من کی کیفیت بہتر ہے اور شاید جلد ہی کچھ لکھا جا سکے درد زہ کے ہلکے سے آثار محسوس ہو رہے ہیں (ص۹۳) اسی دوران میں اماں اور آپا یہاں آئے تھے (ص۹۵) مندرجہ ذیل جملوں میں غالباً پنجابی بولی کا اثر ہے "اور ہم نے بہت احسان مند محسوس کیا (ص۱۴۲) جیل خانے میں اس کیفیت کے لئے آدمی کچھ احسان مند محسوس کرتا ہے" (ص۱۵۶) "اور دل دونوں کے لئے احسان مند محسوس کرتا ہے" (ص۱۸۰) "بلکہ نفسیاتی الجھنوں سے ایذا طلبی کا وہ شدید جذبہ بھی سمجھ میں آتا ہے" (ص۲۱۰) "تمھارے نتائج کا سن کر بہت خوشی ہوئی (ص۳۵) تمھارے نیگرو شاگرد کا سن کر خوشی ہوئی (ص۴۷) حفیظ کی نظم کا سن کر خوشی ہوئی (ص۴۷) اس طرح کے جملے متعدد ہیں، بارشیں (ص۷۹ و ۲۳۳) شامیں (ص۹۲ و ۱۱۴) صبحیں (ص۲۱۶) صبحوں (ص۱۰۵) روشنیاں (ص۲۱۰) وغیرہ جمع کا استعمال بھی گراں معلوم ہوتا ہے، اگرچہ بعض افسانہ نگار، شاعر اور اخبار نویس اس قسم کی جمع بے تکلف استعمال کرنے لگے ہیں اور بعض شاعروں کے یہاں بھی ایسی جمع استعمال ہوتی ہے، مثلاً عشق کا ایک شعر ہے

گردوں نے دکھائیں نئی صبحیں نئی شامیں
کی عرض کر بابا ہوں عجب رنج و بلا میں

لیکن فصحاء ایسی جمع لکھنے سے احتراز کرتے ہیں، لامتناہی کو کئی جگہ لاامتناہی لکھا ہے، جو شاید کتابت کی غلطی ہو۔

"ض"

جلد ۱۳۴ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۴ء عدد ۶

مضامین

معذرت

اس مہینہ میں ملک کی انتخابی مہم کی وجہ سے یہ رسالہ خلاف توقع دیر کرکے روانہ کیا جا رہا ہے، جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے، کاغذ ملنے میں تاخیر ہوئی، بینک اور ڈاکخانے بھی بند رہے،

شذرات

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت نومبر ۱۸۸۴ء میں ہوئی تھی، ۱۹۸۴ء میں ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں نے مختلف جگہوں پر ان کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منائی۔

پیرس سے مکرمی المحترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ نے اطلاع دی کہ وہاں ۲۲ نومبر کو حضرت سید صاحب پر ان سے ٹیلی ویژن پر ایک تقریر کرنے کو کہا گیا ہے، کراچی سے جناب سید فخر الحسن صاحب پرنسپل لیاقت علی خاں ڈگری کالج نے خبر دی کہ ان کے کالج کے زیر اہتمام بڑے پیمانہ پر یہ تقریب منائی جا رہی ہے، ڈاکٹر محمد شمیم نے بھی کراچی سے لکھا کہ دلیسنہ ایسوسی ایشن کی طرف سے بھی یہ منعقد ہو رہی ہے، ان تقریبات کی تفصیلات ابھی موصول نہیں ہوئی ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ایک سمینار ۲۴-۲۵ نومبر کو ہوا، پھر ۱-۲-۳ دسمبر کو بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کی طرف سے بھی ایک باوقار اجتماع ہوا، دار المصنفین کی طرف سے بھی دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعاون سے یہ صد سالہ سالگرہ جلد ہی منائی جانے والی ہے اسکی تفصیلات طے ہو جائیں تو تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سمینار کے متعلق یہ خیال تھا کہ یہ یونیورسٹی کے پیمانہ پر ہوگا، لیکن یہ وہاں کے شعبہ اردو ہی تک محدود رہا، بعض اسباب کی بنا پر اس کی فضا مکدر رہی، جس روز یہ خاکسار شرکت کیلئے علی گڈھ پہنچا تو وہاں کے تہذیب الاخلاق کا تازہ شمارہ اس کے ہاتھ میں دیا گیا، اسکے ایک مضمون کی سرخی یہ تھی، سیرۃ النبی جلد اول و دوم کا مصنف کون؟ علامہ شبلی نعمانی یا مولانا سید سلیمان ندوی، اس کو دیکھتے ہی ایک صاحب بولے یہ دل جلانے والی سرخی ہے، سمینار شروع ہونے سے پہلے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد کی توجہ دلائی، کیونکہ وہ اس رسالہ کے مدیر ہیں، اس سرخی سے ان کو بھی تکلیف پہونچی، جب سمینار کا افتتاح جناب نواب عبید الرحمٰن خان

شروانی پرو چانسلر کر چکے تو جناب سید حامد صاحب اپنے صدارتی خطبہ میں تہذیب الاخلاق کے مضمون کی اشاعت پر اپنی رائے کا اظہار کرکے دار المصنفین والوں سے پورے طور پر معذرت خواہ ہوگئے،

سیمنار کے مقالات کے یہ عنوانات رہے، سیرۃ النبی میں مولانا سید سلیمان ندوی کے اضافے از ڈاکٹر مظہر یٰسین صدیقی، شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی اور علم کلام از مولانا ابوالعرفان خان ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید سلیمان ندوی کا اسلوب از ڈاکٹر عبد الستار صدیقی شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، سیرۃ النبی میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی انشا پردازی، از خاکسار راقم، مولانا سید سلیمان ندوی کی لسانی تحقیقات از ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، مولانا سید سلیمان ندوی اور تصوف از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی۔

علی گڈھ کے قیام میں اس مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس ریڈر شعبہ اردو نے ہر طرح کی خاطر مدارات کی، انھوں نے جناب رشید احمد صدیقی مرحوم پر یونیورسٹی میگزین کا جو خصوصی نمبر تیار کیا ہے اس کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی، انکی محنت اور خوش سلیقگی کی داد دی، جناب پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب (دہلی یونیورسٹی) نے سر سید نگر میں ایک خوبصورت مکان بنوایا ہے، انھوں نے وہاں بلاکر نواب عبید الرحمٰن خان شروانی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے ساتھ ایک بہت ہی خوشگوار شام گذارنے کا موقع فراہم کیا، یہیں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب تاریخ مشایخ چشت جلد پنجم کا ایک نسخہ مرحمت کیا جسکی ترتیب و تدوین کتابت اور طباعت پر علم و فن کو ناز ہو سکتا ہے، پروفیسر خلیق احمد اپنے تصنیفی سلیقہ اور فن میں اس اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں پہنچنا کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، شعبہ اسلامیات کے ڈاکٹر اقبال انصاری اپنی دیرینہ روایات کے ساتھ پیش آئے، ان ہی کے ساتھ انکے شعبہ کے اساتذہ سے ملاقاتیں، اچھا وقت گذرا، وہیں ڈاکٹر محمد راشد ندوی سے بھی ملاقات رہی جو اب شعبہ عربی کے پروفیسر ہوگئے ہیں،

علی گڈھ سے واپسی پر فوراً ہی بہار اردو اکیڈمی کے سیمنار کیلئے پٹنہ روانہ ہونا پڑا، ساتھ مولوی ضیاء الدین اصلاحی مولوی ابوالبقا ندوی اور حافظ عمیر الصدیق ندوی اور مولوی عبد الباری تھے، یہ سیمنار اچھے پیمانہ پر منعقد کیا گیا، اسکے روح رواں جناب سید شہاب الدین دسنوی تھے، جو اسوقت بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین ہیں، وہ ہر کام کو بڑی خوش سلیقگی سے انجام دینے میں ماہر ہیں جسکا اظہار اس موقع پر بھی ہوتا رہا، ان کے پر مغز اور جامع خطبہ استقبالیہ میں حضرت سید صاحب

کے گوناگون پہلوؤں کا احاطہ بڑی خوبی سے کیا گیا تھا، صدارت بہار کے بہت ہی محبوب ہر دلعزیز باوقار اور ملنسار گورنر جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی کی تھی، خصوصی مہمان حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے، انکو حضرت سید صاحب سے جو والہانہ عقیدت، محبت اور شیفتگی تھی، اس کا اظہار انکی تقریر کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری میں پورے طور پر ہو رہا تھا جس کو سن کر پورا مجمع مسرور اور مخمور تھا، پروفیسر عبد القوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال نے یادگار سلیمان کے نام سے بڑی محنت سے ایک کتاب تیار کی ہے، جس کا اجرا حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کے دست مبارک سے ہوا، یہ حضرت سید صاحب کے سوانح حیات اور علمی کارناموں کی بڑی مفید ببلوگرافی ہے، اس سے ان کو سمجھنے اور ان پر کوئی تحریر لکھنے میں برابر مدد ملتی رہے گی۔

اس سیمنار میں جو مقالات پڑھے گئے، انکے عنوانات ہی سے اسکے علمی رنگ کا اندازہ ہوگا، (۱) مولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت تنقید نگار، از پروفیسر عبد المغنی پٹنہ یونیورسٹی (۲) مولانا سید سلیمان ندوی کی نثر نگاری، از پروفیسر وہاب اشرفی (۳) علامہ سید سلیمان ندوی طرز انشا پرداز، از ڈاکٹر سید مظفر اقبال (۴) علامہ سید سلیمان ندوی محقق عصر، از ڈاکٹر لطف الرحمٰن بھاگلپور (۵) مولانا سید سلیمان ندوی اور تصوف، از ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلی (۶) علامہ سید سلیمان ندوی بہ حیثیت محقق از ڈاکٹر خورشید احمد نعمانی بمبئی (۷) مولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت لسانی محقق از ڈاکٹر حامد حسن بھوپال (۸) مولانا سید سلیمان ندوی بہ حیثیت شاعر، از پروفیسر ممتاز احمد پٹنہ (۹) تاریخ ارض القرآن میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات از حافظ عمیر الصدیق اعظم گڈھ (۱۰) مولانا سید سلیمان ندوی کے افکار و اسالیب از ڈاکٹر شیخ فرید بمبئی (۱۱) حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت نگاری، از مولوی ضیاء الدین اصلاحی اعظم گڈھ (۱۲) حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور معارف کے شذرات از مولوی ابوالبقاء ندوی، اعظم گڈھ (۱۳) حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اپنے کچھ خطوط کے آئینے میں از پروفیسر سید حسن پٹنہ (۱۴) مولانا سید سلیمان ندوی کی شاعری از پروفیسر عبد القوی دسنوی (۱۵) مولانا سید سلیمان ندوی اور دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی کی کوشش از جناب شہاب الدین دسنوی (۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی کی لسانی خدمات از ڈاکٹر خلیق انجم دہلی (۱۷) ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے از خاکسار راقم۔

اس سیمینار میں سید صاحب کے خطوط، مسودات تصنیفات، اور تصویروں کی بھی نمائش بڑے سلیقہ سے ترتیب دی گئی تھی، پورے سیمینار کی فضا پر حضرت سید صاحبؒ کی روح چھائی ہوئی تھی، یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی، جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب راج بھون کے لنچ میں جو تمکین سے جس خاکساری اور ملنساری سے ملتے رہے، اس کا گہرا نقش دلوں پر پڑا۔

اس سفر میں پٹنہ یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے کلاس کے طلبہ کو ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے ساتھ مخاطب کرنے کا موقع ملا، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات کے سابق پروفیسر جناب ڈاکٹر محمد محسن کے ساتھ ان کے گھر پر ایک بہت اچھی شام گذری، ان کی ذاتی علمی، اور ادبی خوبیوں کے تحائف لے کر ان کے یہاں سے اٹھا وہ اس وقت ممتاز ماہرین نفسیات میں شمار ہوتے ہیں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں دادا محسن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں انھوں نے اپنی دو نئی تصانیف نفسیاتی زاویے اور سعادت حسن منٹو (ایک نفسیاتی تجزیہ) تحفے کے طور پر دیں، جن پر معارف میں جلد ہی ریویو ہوگا۔

اس سفر میں پھلواری شریف بھی جانے کا اتفاق ہوا، جہاں امارت شرعیہ کی نئی عمارت دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی، اس کے ناظم مولانا نظام الدین صاحب نے ہر طرح کی تواضع کی جس نوعیت کا کام اس کے ذریعہ سے ہو رہا ہے، اس کی حیثیت پورے ہندوستان کے اندر منفردانہ کہی جا سکتی ہے، اس میں جو دینی جذبہ اور اخلاص نظر آیا کاش وہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں دکھلائی دے، خانقاہ مجیبیہ میں بھی حاضری دے کر جناب حضور حضرت شاہ امان اللہ کی دست بوسی کی اور جناب شاہ عون احمد صاحب کے صاحبزادے شاہ نصر احمد مرحوم کی جوان مرگی پر پوری غمناکی کے ساتھ تعزیت کی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان کی خوبیوں کی بدولت جنت نعیم اور والدین کو صبر جمیل مرحمت فرمائے، آمین بہار کے مشہور شاعر جناب جوہر نظامی نے چلتے وقت اپنا مجموعہ کلام فردوس خیال عطا کیا، ان کی کرم فرمائیوں کا بھی ممنون ہوا،

مقالات

تاریخ ارض القرآن

میں

مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

تاریخ ارض القرآن مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے، مگر علم و نظر اور تحقیق و تنقید کی وسعت اور جامعیت کے لحاظ سے اس کا شمار ان کی شاہکار تصنیفات میں ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں عرب کی قدیم قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین، سبا اور قوم تبع وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے، پیغمبروں اور ان کی قوموں کے ساتھ ان کے علاقوں اور بستیوں کا بھی ذکر ہے، قدیم مفسرین کا اصل مقصد جغرافی اور تاریخی انکشافات کی تحقیق نہ تھا، اس لیے ان سے بعض اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں کچھ تسامح ہوا، اور ایک زمانہ کے بعد جب مستشرقین یورپ کے سامنے جدید جغرافی و تاریخی حقیقتیں آئیں تو ان کی کلیسانہ فطرت کو مسلمان مفسرین و مورخین پر حتی کہ خود قرآن مجید کے بیانات پر شک اور اعتراض کرنے کا

موقع ہاتھ آیا، ان کی ظاہری علمی سنجیدگی نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو بھی کچھ حد تک متاثر کیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے پیش نظر یہ سارے حقائق تھے، چنانچہ ارض القرآن میں جہاں عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق ہے، وہاں مستشرقین کے بعض اعتراضات کے جوابات بھی ہیں، سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بھی اسی جذبہ کی خاص کارفرمائی تھی، ارض القرآن کو سیرۃ النبیؐ کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، جیساکہ خود سید صاحبؒ نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ لکھنؤ میں دفتر سیرت نبویؐ کے جب وہ اسسٹنٹ تھے تو اس موضوع کا خیال آیا، بلکہ اصل میں سیرت نبویؐ کے دیباچہ ہی کے طور پر اس کے لکھنے کی تحریک ہوئی، (دیباچہ ج ۱، ص ۶، اڈیشن ۴ ۱۹۵۵ء) لیکن جیسے جیسے سید صاحب آگے بڑھتے گئے میدان زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ بالکل مستقل ایک تصنیف بن گئی.

سیرۃ النبیؐ کی طرح سید صاحبؒ کا طرز تحریر اس کتاب میں بھی مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہے، اس میں جہاں مستشرقین کے غلط اور باطل نظریات و تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے وہاں ان کی محنت و کاوش کی داد بھی دی گئی ہے، البتہ جب ذات رسالتمآبؐ پر کسی نے انگشت نمائی کی کوشش کی ہے تو سید صاحبؒ کے قلم میں ایک شدت ضرور پیدا ہوگئی ہے،

اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات جواہر ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، اس مضمون میں ان کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس کتاب کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے، ورنہ درحقیقت اس کتاب کی علمی افادیت اور تاریخی اہمیت کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا تھا کہ اس کتاب میں ایک خاص پہلو سے 'قرآن فہمی' کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہوگیا' (حوالہ مضمون تاریخ ارض القرآن از مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف سلیمان نمبر ص ۲۱،

سید صاحبؒ نے شروع میں ایک بڑا قیمتی مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں اس کتاب کے موضوع اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کے ساتھ ارض القرآن (عرب) کے حالات کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہوجائے.

قرآن مجید نے عبرت کے طور پر عرب کی کئی قوموں اور ان کے انبیاء کے حالات بیان کیے ہیں، چونکہ عرب کی قوم تصنیف و تالیف سے آشنا نہیں تھی، اس لیے ان انبیاء و اقوام اور ان کے تاریخی، سیاسی، قومی، مذہبی اور جغرافی حالات کی تفصیل میں مسلمان مصنفوں نے غیر محتاط طریقہ پر زبانی روایات سے کام لیا، جبکہ اہل یورپ نے اس کے برخلاف یونانی و رومی سیاحوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثار قدیمہ اور نقوش و کتبات کو دلیل میں پیش کیا، سید صاحب لکھتے ہیں:

"اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں، اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ کہنے کی جرأت ہوئی." (تاریخ ارض القرآن ج ۱، ص ۴، اڈیشن چہارم ۱۹۵۵ء)

سید صاحبؒ کو مستشرقین کی محنت و کاوش اور جانفشانی و کوشش کا بخوبی احساس تھا وہ اُن جرمن، فرانسیسی، اٹالین اور انگریز مستشرقوں کے کام سے واقف تھے کہ ان لوگوں نے یونانی و رومی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر تھیں، ان کا انتخاب خلاصہ کیا

قرآن مجید نے جن قوموں اور بستیوں کا ذکر کیا ہے، ان کے کھنڈروں کا ان لوگوں نے مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا اور پھر ان سے عجیب و غریب نتائج کا استنباط کیا، مگر سید صاحبؒ کے سامنے حقیقت بھی تھی کہ یہ مستشرق مسلمان نہیں، یہودی یا عیسائی ہیں اور ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :

"بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریورنڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا، جس میں اس نے اپنی جہالت کے عجیب و غریب نمونے پیش کیے، جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے، لیکن کیا کیجیے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن کی صداقت تاریخی کا معیار ہے، ..... نولدیکی نے عمالقہ و عاد کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں، ولکن اور روبرٹسن اسمتھ عرب کے ادعائے نسب کا انکار کرتے ہیں، عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ کہتے ہیں کہ "قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، لیکن ایک فرانسیسی مستشرق سینٹ ہلیر نے اس کا عمدہ جواب بھی دے دیا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو قرآن تمدن و تہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات اور کم از کم محرمات نکاح کے بیان کی تکلیف گوارا نہ کرتا،"

(ایضاً، ص ۵)

سید صاحبؒ نے ارض القرآن کی تاریخ و تحقیق کے لیے چار مآخذ کو سامنے رکھا ہے، (۱) ادبیات اسلامیہ (۲) ادبیات اسرائیلیہ (۳) ادبیات یونانیہ و رومانیہ اور (۴) اکتشافات اثریہ (آرکیالوجیکل ڈسکوریز) اس سلسلہ میں انھوں نے چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے بنظر استحسان دیکھا ہے، مثلاً ابن الحائک ہمدانی ایک عرب جغرافیہ نویس تھے، ان کی دو کتابیں صفۃ جزیرۃ العرب

اور 'اکلیل' ہیں، پہلی کتاب عام جزیرۂ عرب کا جغرافیہ اور دوسری کتاب 'الاکلیل' صرف یمن کی تاریخ ہے، یورپ میں اس کتاب کا اکثر حصہ برٹش میوزیم لندن اور رائل لائبریری برلن میں موجود ہے ان کے علاوہ سید صاحب نے کئی اور کتابوں کا ذکر کیا ہے (ایضاً ص ۱۷ - ۱۹)

انساب اور مستشرقین

فن انساب، عرب کا ایک محبوب فن تھا، فخر و مباہات کے اظہار کے لیے عرب کا بچہ بچہ اپنے نسب کا یاد رکھنا ضروری سمجھتا تھا، شعرائے عرب اکثر قبائل کے سلسلۂ انساب کو محفوظ رکھتے تھے، اور ان کے لیے یہ اس لیے ضروری تھا کہ مدح و ہجو کے موقعوں پر اس کا ذکر کر سکیں، زمانۂ جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی، عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں، جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلہ کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے اور جب دوسرے علوم کی تدوین کا کام شروع ہوا تو یہ فن بھی مدون ہوا، اور علمائے انساب نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، دغفل بکری، ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، زبیری، زبیر بن بکار، اصمعی، ابو عبیدہ ابن ہشام، مبرد، ازرقی، بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کی روایات میں کمزور اور یقینی صحت میں کمتر درجہ کی بھی ہیں، لیکن روبرٹسن اسمتھ اور نولدیکی ان روایات سے آگے بڑھ کر اس پورے فن کا ہی انکار کرتے ہیں، نولدیکی لکھتا ہے :

"اب علماء کے لیے موقع آگیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈال دیں جو چاہتے ہیں کہ عربوں کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑ لیا ہے، مان لیں، تاکہ باہم قبائل عرب قدیمہ و جدیدہ کے تعلقات تحقیق و یقین کے ساتھ ظاہر ہوں، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں، وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں یعنی قیس کی، جو مسیح سے کچھ پہلے تھا، اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ

درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے (ایضاً ص ۲۰)

روبرٹسن اسمتھ کا خیال بھی یہی ہے کہ:

"یہ محقق ہوچکا ہے کہ چند قبائل زمانہ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب نہ تھے"

(ایضاً، ص ۲۱)

سید صاحبؒ نے ان دونوں مستشرقوں کی رائے کو نقل کرکے ان سے دریافت کیا ہے کہ آخر اس بے اعتباری کے دلائل کیا ہیں؟ وہ لکھتے ہیں کہ:

"عرب کے ایک ایک قبیلہ کے لیے ضروری تھا کہ دوستوں کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے لیے انساب محفوظ رکھے، عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف انتساب کرتا وہ عرب میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا، اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، شعرائے عرب مختلف مواقع کے لیے انساب کے زبانی یاد رکھنے پر مجبور رہتے تھے، کیا ان واقعات کے بعد بھی اس عام بے اعتباری کی کوئی مناسب وجہ ہے؟ بنو قیس کی طرح چھ سو برس کی مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون وقبائل کا پیدا ہوجانا کوئی محال امر نہیں۔" (ایضاً ص ۲۱)

سید صاحبؒ اس کے بعد ان مستشرقین کے اعتراض کی اصل وجہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"یورپ کے ان علمی توہم پرستوں کے انکار انساب کی بنیاد مسئلہ طوطمیت (ٹوٹزم) پر ہے، طوطمیت اس کا نام ہے کہ "اشخاص وقبائل کا اپنے کو دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف منسوب کرنا۔" قدیم زمانہ میں جب انسان بچہ تھا، جب کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا تھا تو وہ انسانوں کی ولدیت سے نکل کر دیویوں کی نسل قرار پاتا تھا، وہ دیویاں خواہ ستارے ہوں یا حیوانات ہوں یا درخت ہوں، ہندوؤں میں سورج بنسی اور چندر بنسی وغیرہ قبائل تھے، جو اپنے کو انسانوں کے نہیں بلکہ آفتاب و ماہتاب کے بیٹے

کہتے تھے، اس لیے سورج اور چاند کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ اس قبیلہ کے مورث اول کا نام ہے، بلکہ وہ اس قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔"

"قبائل عرب میں بھی بنو شمس وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں، اور حیوانات کے نام تو بکثرت آتے ہیں، جیسے بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل، بنو عجل وغیرہ، نظریۂ طوطمیت کے مطابق شمس، اسد، فہد، ثعلب، کلب، نمل، عجل اشخاص تاریخی نہیں ہیں، اور نہ ان قبائل کے مورث اول کے نام ہیں، بلکہ یہ ان ستاروں اور جانوروں کے نام ہیں، جن کی پرستش وہ قبیلے کرتے تھے اور ان ہی کی طرف اپنے کو منسوب سمجھتے تھے، لیکن یہ محض علمی توہم پرستی ہے، عرب میں کبھی اس قسم کا خیال نہیں پیدا ہوا، اس خیال کی پیدائش عراق، ہندوستان، مصر اور یونان کی میتھالوجی (علم الاصنام) میں ممکن ہے، اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں اور جو ہیں ان میں کلب (کتا)، نمل (چیونٹی)، ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہو اور یہ اس قسم کے نام ہیں جن سے اس زمانۂ روشن کا طبقۂ متمدن بھی خالی نہیں، تم نے بعض انگریزوں کے نام Fox (لومڑی) بل (Bull) بیل سنے ہوں گے، کیا یہ بھی طوطمیت ہے؟" (ایضاً ص ۲۰، ۲۱، ۲۲)

سید صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے نولدیکی اور ان کے ہم نواؤں کے اعتراضات کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

ادبیات رومانیہ کا ایک جغرافیہ نویس

سید صاحب نے ادبیات یونانیہ ورومانیہ کے زیر عنوان ایک باب قائم کیا جس میں ان یونانی ورومانی مورخوں اور سیاحوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے جو قرآن کی مذکورہ قوموں کے معاصر یا قریب العصر تھے، ان میں بطلیموس اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں وجغرافیہ نویس تھا، اس نے خود تو عرب کی سیاحت نہیں کی تھی، تاہم اسکندریہ میں

عرب تاجروں سے وہ ملاقاتیں کرتا تھا، ان تاجروں اور دوکانداروں سے دریافت کرکے اس نے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا تھا، اور اس میں عرب کے مشہور قبائل، شہر، گاؤں، پہاڑ، سواحل، تجارتی منازل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا تھا، عرب آبادان میں اس کے بیان کے مطابق ۱۱۴ آبادیاں تھیں، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چند ناموں کے سوا اب ان قبائل و منازل کے نام خارج از فہم ہیں، جرمن مستشرق اسپرنگر کی کتاب "قدیم جغرافیہ عرب" جو ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی تھی، اس میں بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا گیا تھا اور بطلیموس کے مذکورہ ناموں کی صحت ثابت کی گئی تھی، لیکن سید صاحب اسپرنگر کی اس تحقیق و تطبیق سے متفق نہیں، وہ لکھتے ہیں کہ

"حقیقت یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بہ تکلف ہوسکتی ہے، اور اس کی مثالیں ہماری کتاب میں جا بجا ملیں گی، اور یہی شکایت مسعودی اور یاقوت حموی تقریباً آٹھ سو برس پہلے کرچکے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبائل عرب زیادہ تر بدویانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، قافلوں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حرف و لہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن، ان وجوہ سے قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں کہاں جا پڑا ہوگا۔" (ایضاً ص ۲۸، ۲۹)

اکتشافات اثریہ اور مستشرقین

اکتشافات اثریہ (ص ۳۱) کے زیر عنوان سید صاحبؒ نے قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاروں کی بازیافت کی مہم میں علمائے یورپ کی کوششوں کی تعریف کی ہے، کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی

اور نبطی خط میں ہیں، ان کتبات کو حل کرنے کے فن کو مستشرقین نے بے حد ترقی دی اور اس شاخ میں بے انتہا برگ و بار پیدا کرکے اس کو مستقل ایک فن بنا دیا، لیکن سید صاحبؒ کی تحقیق کے مطابق بہر حال اولیت کا سہرا ان کے سر نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں :

" دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں جبکہ تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا، ان آثار کی تحقیق کی گئی اور ان میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اس عہد کے علماء واقف تھے، ذوالنون مصریؒ جو دوسری صدی میں تھے، مصر کے خط برابی (بیروگلفی) پڑھتے تھے، حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب اور اکلیل میں تمام مشہور آثار کے نام گنائے ہیں، اور ان کے تفصیلی حالات کے لیے اپنی کتاب 'اکلیل' کا حوالہ دیا ہے، قلعہ ناعط جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا، اسلام سے تقریباً پندرہ سو برس قبل کی تعمیر ہے، وہب ابن منبہ (جنھوں نے صحابہؓ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا ہمدانی کے علاوہ مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں، یاقوت نے اپنی معجم میں، نویری نے اپنے جغرافیہ میں اور قزوینی نے اپنی آثار البلاد میں اسی قسم کے آثار و کتبات کا ذکر کیا ہے۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۳۲، ۳۴، ۳۵)

لیکن سیّد صاحبؒ نے فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بہر حال ادھوری کوششیں تھیں، علمائے یورپ نے ان کو بہت ترقی دی، اس کے بعد سید صاحبؒ نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور مختلف سیّاحوں مثلاً نیوبھر، ہزبرگ، ہمپرچ، ارناؤ، ہالوے، وریڈے، ہرشی برکھارڈ، بیڈے ایچ، چارلس ڈوٹے اور ہیوبر کی تحقیقات و اکتشافات کا ذکر ایجاز کے ساتھ کیا ہے، ہیوبر کی تحقیقات کو وہ عام حالات و واقعات سے بلند تر اور زیادہ علمی سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ ہیوبر کو عرب کی آرکیالوجی اور ٹاپوگرافی کا محسن سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۴۴)

تاریخ قدیم کے بعض اصول

سید صاحبؒ نے تاریخ قدیم کے بعض اصول کے تحت مختصر مگر نہایت عالمانہ

بحث کی ہے، تاریخ قدیم کی ترتیب و تدوین میں سب سے بڑی دقت اور دشواری جو پیش
آتی ہے، وہ زمانہ کی تعیین اور ناموں کے اتحاد و اختلاف کی ہوتی ہے، سید صاحب نے اس ضمن
میں چند اصول مقرر کیے ہیں، مثلاً اصول تعیین زمانہ یعنی جدید طرز تاریخ کی رو سے قبائل کے دور
اور عہد کی تعیین کی جائے، عام طور سے کسی مجہول العہد قوم کے زمانہ کی تعیین اس طور پر کی جاتی ہے
کہ اسی قوم کی ہمعصر قوم یا کسی شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، ایک اصول یہ بھی ہے کہ
تاریخی اشخاص اور ان کے مقامات سکونت کے ناموں کا یا دو قوموں کی زبان، اشخاص اور دیوتاؤں
کے ناموں کی آپس میں تطبیق دی جائے جس سے مقامات سکونت اور اتحاد قومیت کی طرف
اشارہ مل سکتا ہے، مستشرق فارسٹر نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی کتاب 'عرب کا
تاریخی جغرافیہ' میں چند نتائج پیدا کیے، سید صاحبؒ ان نتائج کو کار آمد قرار دیتے ہیں،
گو بعض مقامات پر فارسٹر صاحب کے استنباطات سید صاحبؒ کی رائے کے مطابق وہم
و ظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں،
فارسٹر کے اخذ کردہ اصول کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس اصول کے اجراء میں دو بہت بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، پہلی یہ کہ زمانہ
کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ
ہو گئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے
بجائے کبھی صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے
سہل تر ہے' یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور نیز یونانی زبان میں جس میں
تورات کا قدیم ترجمہ ہے اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام
ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو بعض حروف کا خصوصیت زبان

کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے، مثلاً آجر اور ہاجر، اسمائیل اور اسماعیل، تہود
اور ثمود، حصارموت اور حضارموت، اضحاک اور اسحاق، حدرموت اور
حضرموت، ابی رہام اور ابراہیم وغیرہ۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے اصول اتحاد اسماء والسنۃ کو اس بحث میں سب سے
مفید اور کار آمد قرار دیا ہے کہ ہر قوم کے ناموں کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے، جس میں اس کی قومیت
کا امتیاز پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا تو آسانی
سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، یہی حال مذہبی اعتقادات کے
تشابہ اور زبان کے الفاظ کی مماثلت کا بھی ہے، سید صاحبؒ کی نظر میں اقوام کے اتحاد نسل کی
یہ بھی ایک دلیل ہے، گو مبہم ہے۔

جغرافیہ عرب اور فارسٹر اوپر بطلیموس کا ذکر آچکا ہے، جس نے عرب کی جغرافی تقسیم کو مرتب کیا،
اور اس کی یہ ترتیب سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہوئی، اس نے اپنے جغرافیہ میں عرب کے
۵۴ قبائل، ۱۶۴ مقامات، ۵۰، کوہستانی سلسلے اور ۴ دریاؤں کا ذکر ہے، لیکن بطلیموس
کے مخالفوں کو ان ناموں کے تسلیم کرنے میں پس و پیش ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان ناموں کا وجود
و مصداق بطلیموس کے دماغ کے سوا خارج میں کہیں نہیں ہے، لیکن بطلیموس کے معتقدین
اس الزام سے برہم نظر آتے ہیں، ان کی نمائندگی فارسٹر کرتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب
میں ۱۵۰ ناموں کی تحقیق کی ہے، سید صاحبؒ اس تحقیق کو 'عالمانہ جہالت' سے تعبیر کرتے ہیں،
وہ لکھتے ہیں کہ:

"غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں
کب آباد ہوئے اور عربی میں ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموسی قبائل کے

ناموں کو حروف کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم
کہ اب قدیم قبائل کے نام بالکل نئے ہیں۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۷۱)

بطلیموسی جغرافیہ کے تحت تین قبیلوں کو سب سے زیادہ اور پرزور اور طاقت ور بتایا گیا ہے، یہ قبائل ہیں: (۱) بنی زومین (۲) سیڈینی اور (۳) بنو بری، ان تینوں قبیلوں کو بحر احمر کے ساحلی علاقوں میں خلیج عقبہ سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیا گیا ہے، لیکن سید صاحبؒ پوچھتے ہیں کہ ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں؟ کیونکہ ان ناموں کا قبیلہ عرب میں تو موجود نہیں ہے لیکن ریونڈ فارسٹر بغیر کسی شک و سوال کے یقینی انداز میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بنی زومین بنی عمران ہیں، سیڈینی قبیلہ جہینہ کا نام ہے، اور بنی بری یہ کنوئیں والا قبیلہ ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ بطلیموس کے دو ہزار برس کے بعد یورپین سیاحوں برکھارٹ اور نیبھر نے انہی مقامات میں مذکورہ قبائل کو دیکھا ہے، سید صاحبؒ اس دلیل کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

"صاف ظاہر ہے کہ زومین خزیمین ہے، سیڈینی سیدین ہے اور بنو بری
بنو بر ہیں، فارسٹر کی عربی دانی ملاحظہ ہو کہ عربی میں چونکہ کنوئیں کو بئر کہتے ہیں، اس لیے
انھوں نے بری کے معنی بھی کنوئیں کے ہی سمجھے، خزیمہ حجاز میں، سیدین اور بر بر دیگر
اطراف میں مشہور قبائل ہیں۔" (ص ۸۰)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے بطلیموسی قبائل کے ناموں کی ایک فہرست دی ہے، جس میں یونانی تلفظ انگریزی و فارسی رسم الخط میں دیا گیا ہے، پھر فارسٹر کی رائے دی ہے اور اس کے مقابل انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً ڈیبائی کو فارسٹر زبید کہتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ اس کو ضبّہ کہتے ہیں، الاثمیاری کو فارسٹر بنی یام اور سید صاحب بنو عیلام قرار دیتے ہیں، مانی ٹانی اور کیتھی بانی تانی کو فارسٹر اہل منیٰ اور بنو قحطان سمجھتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ

معین (واقع یمن) اور قتابین (قتاب واقع یمن) قرار دیتے ہیں، ایک نام و آخری مونائی ہے، اس کو فارسٹر دار القرامطہ (واقع بحرین) سمجھتے ہیں، سید صاحبؒ اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ:

"غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس
بعد ہوا ہے۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۹۱)

ریونڈ فارسٹر کو صرف اسی پر اصرار نہیں ہے کہ بنی زومین بنی عمران ہیں اور یہ کہ ان کا مسکن حجاز نہیں ہے بلکہ خلیج عقبہ ہے، اور اس اصرار کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسیحؑ سے سولہ برس پہلے سسلی کے ڈانڈورس نے لکھا تھا کہ "بنی زومین کے ملک میں ایک معبد ہے جس کی تمام عرب عزت کرتے ہیں"، اس معبد کو ان علمائے یورپ نے جو کہ ریونڈ یعنی پادری نہیں ہیں انھوں نے بھی کعبہ سمجھا ہے، ظاہر ہے کہ کعبۂ حجاز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سید صاحبؒ نے اس نکتہ کو بھی محسوس کیا، اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی بحث وہ الگ کریں گے۔

امم سامیہ کا مسکن اول اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نے نہایت محققانہ بحث کی ہے، جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس بحث میں سید صاحبؒ نے مستشرقین کی ایک جماعت کے خیالات کو قبول کیا ہے، بحث یہ ہے کہ زمانہ تاریخ سے پہلے جو سامی قومیں الگ الگ لیکن متصل مقامات میں آباد تھیں اور صرف چند کنبوں میں تقسیم تھیں تو ان کا مسکن کہاں تھا؟ عرب کے مورخین کے پاس تو اس کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا مسکن عرب تھا، لیکن یورپ کے علماء و محققین نے اس سوال کے جواب میں چار نظریے پیش کیے، ان کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ ان سامی قوموں کا پہلا مسکن افریقہ ہے، جہاں سام کے بھائی حام کی اولاد، زمانۂ تاریخی میں آباد ملتی ہے، ان محققین کی دلیل یہ ہے کہ

سامی اور حامی زبانوں میں بہت مشابہت ہے، نیز یہ کہ سامی اور حامی اور خصوصاً جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں (حبشی) کے بعض اعضا میں مکمل مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن سید صاحبؒ اس دلیل کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ دلیل نہایت عجیب ہے، دو بھائیوں میں اگر مشابہت پائی جاتی ہے' اور ایک افریقہ میں رہتا ہو تو کیا ضرور ہے کہ دوسرا بھی افریقہ ہی میں پہلے رہتا ہو، یہ کیوں نہیں فرض کیا جاسکتا کہ خود حامی پہلے سامی خاندانوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ایک مدت کی یکجائی کے بعد ان سے الگ ہوئے، اسی یکجائی و اجتماع و اتحاد نسل کے بقیہ آثار دونوں میں موجود ہیں۔" (ارض القرآن ج ا ص ۱۰۷)

جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں میں مشابہت کی دلیل سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

"جنوبی عرب (یمن) اور حبشیوں میں یقیناً تشابہ ہے، لیکن اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، حبش کی کوئی مستقل آبادی و نسل نہیں ہے، بلکہ وہ یمنی عربوں کی ایک نو آبادی ہے' اور ان کی نسل کا مخلوط حصہ ہے، اسی لیے عرب ان کو حبش (مخلوط) کہتے ہیں، اور اسی بنا پر قدیم مورخین، یمن و حبش کو دو مستقل ملک نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک ہی ملک (ایتوبیا) کے ان کو دو ٹکڑے سمجھتے ہیں۔" (ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸)

مستشرقین کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بنو سام کا پہلا وطن آرمینیہ اور کردستان ہے، لیکن سید صاحبؒ کا خیال ہے کہ اس تھیوری کی صحت پر تورات کے چند الفاظ کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے، خود نولدیکی بھی اس نظریہ کو صحیح نہیں مانتا۔ (ایضاً ص ۱۰۸)

تیسرا نظریہ ایک اطالوی مستشرق پروفیسر گیڈی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ سامیوں کا مسکن اول فرات کا نشیبی حصہ تھا، پروفیسر گیڈی نے اپنے اس دعوی کو ان مقدمات پر قائم

کیا ہے کہ "ابتدائی زبان میں سب سے پہلے ابتدائی ضروریات اور گرد و پیش کی چیزوں کیلیے الفاظ پیدا ہوں گے اور اس لیے یہ الفاظ عموماً مختلف خاندانوں اور زبانوں میں تقسیم ہونے کے بعد بطور ترکۂ موروثی کے مشترک طور پر باقی رہیں گے، سامی زبان میں اس قسم کی چیزوں کے لیے جو مشترک الفاظ ہیں مجموعی طور پر ان کا وجود جہاں پایا جائے گا وہی امم سامیہ کا مسکن اول ہوگا، اس حیثیت سے جو مشترک چیزیں معلوم ہوتی ہیں' ان کی شہادت ہے کہ وہ فرات کے حصۂ زیریں کی پیداوار ہیں۔" (ارض القرآن ج ا ص ۱۰۸)

پروفیسر گیڈی کی ان رایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان سے پہلے اسی قسم کی دلیل وان کریمر نے قائم کی تھی اور ان کا خیال یہ تھا کہ سامی قوموں کا ابتدائی مسکن ایشیائے وسطی میں نہر جیحون و سیحون کے پاس ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"ایک ہی قسم کی دلیل سے دو مختلف نتائج کا ظہور' دونوں کے ابطال کی دلیل ہے۔" (ص ۱۰۹)

چوتھی دلیل اس بحث میں یہ ہے کہ بنو سام کا مسکن اول ملک عرب ہے، سید صاحبؒ کی رائے میں یہ دلیل قرین صواب اور باعتبار دلائل مستحکم ہے، مستشرقین کی ایک بڑی جماعت بھی اسی رائے کی موید ہے، ان لوگوں میں ڈی فوئی، شریڈر، اسپرنگر، نولدیکی، رابرٹسن اسمتھ سموال لے انگ، ولیم رائٹ اور راجرس وغیرہ شامل ہیں، سید صاحبؒ نے ان لوگوں کی رایوں کو تلخیص کے ساتھ نقل کیا ہے، بالخصوص انھوں نے نولدیکی کے ساتھ خاص اعتنا کیا ہے، ان کی رائے کو نقل کرنے سے پہلے ان کو "موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ہم یہاں نولدیکی کی رائے کو نقل کرتے ہیں کہ اس کی افادیت کا یہی تقاضا ہے، نولدیکی کی عبارت یہ ہے:

"بعض مشہور محققین خیال کرتے ہیں کہ جنس سامی کا مولد عرب ہوسکتا ہے' بہت سی چیزیں ایسی

جو اس تھیوری کی تائید کیا کرتی ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے عرب کے ریگستان سے قبائل نکل نکل کر قریب کے سرسبز ممالک میں آباد ہوتے رہے ہیں، آرامی اور عربی زبانوں میں بہت سے ایسے نشانات پائے جاتے ہیں، جن سے ابتدائی خانہ بدوشانہ حالت پائی جاتی ہے اور عرب کا شمالی حصہ صحرائے مابین شام و عرب، خانہ بدوش قبائل کا مسکن ہے، اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان قریب ترین اصل زبان ہے۔"

"ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ یہ تھیوری کہ عرب امم سامیہ کا مسکن اول ہے، کسی معنی سے غیر معقول نہیں ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۲)

سید صاحبؒ اس بحث کے آخر میں اسی فیصلہ کا اعلان کرتے ہیں کہ عرب کے سوا قدیم زمانہ سے کوئی قوم اس کی مدعی نہیں ہے کہ ان کا ملک بنو سام کا مسکن اور امم سامیہ کا مسقط الراس ہے، عرب عام طور پر اس کے مدعی ہیں اور حق یہ ہے کہ شواہد و قرائن کی شہادت کے ساتھ جب کوئی دوسرا مدعی موجود نہیں تو مقدمہ انہی کے حق میں فیصل ہونا چاہیے، اس کے بعد سید صاحبؒ نے ابن قتیبہ اور یعقوبی کی دو تحریروں کو پیش کیا ہے، اور آخر میں یہ بلیغ نقرہ بھی سپرد تحریر کر دیا کہ:

"ان مقدمات پر ایک دفعہ کا اور اضافہ کرو کہ قرآن مکہ کو ام القریٰ (آبادیوں کی ماں) کا خطاب دیتا ہے: لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا" (ص ۱۱۵)

(باقی)

علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت تنقید نگار

از: پروفیسر عبدالمغنی صدر شعبہ انگریزی، پٹنہ یونیورسٹی

بحیثیت ایک مورخ اور محقق یا عالم کے علامہ سید سلیمان ندوی عصر حاضر کی چند اہم ترین شخصیتوں میں ایک ہیں، اور ان حیثیتوں سے ان کے قلم کی فتوحات عالم گیر ہیں، ہندوستان اور مشرق وسطی سے آگے بڑھ کر یورپ کے مستشرقین تک انھیں ایک سند مانتے ہیں، اس کے علاوہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نگراں، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سرپرست، معارف اعظم گڈھ کے مدیر اور قومی و ملی مجالس کے خطیب کی متنوع حیثیتوں سے وہ اپنے وقت کے ایک نمایاں ترین رہنما تھے، واقعہ یہ ہے کہ علمی اور عملی دونوں جہتوں سے وہ اپنے مشہور عالم استاد علامہ شبلی نعمانی کے بہترین جانشین تھے، علامہ شبلی اردو کے عظیم ترین نقاد تھے، اور ان کی معرکہ آرا تنقیدی کتاب شعر العجم، کا کوئی جواب اب تک کی اردو تنقید میں نہیں ہے، ان کی دوسری تصنیف موازنہ انیس و دبیر بھی اردو میں عملی تنقید کی بہترین کتاب ہے، بلاشبہ یہ دونوں عظیم تصنیفات مشرقی انداز تنقید کی نمائندہ اور نمونہ ہیں، لیکن مشرقی انداز تنقید بھی ایک مستند انداز تنقید ہے اور جہاں تک فن کی تنقید کا تعلق ہے، بہ وجوہ مغربی انداز تنقید سے بہتر ہے، اس لیے کہ مشرقی طریقہ ادب کی فصاحت و بلاغت کی تشریح اور تجزیے کا ہے، جو عناصر فن کی تفہیم و توضیح کا سب سے موثر اور مفید طریقہ ہے، جب کہ اس کے برخلاف عصر حاضر میں مغرب کی تنقید کے جو نمونے سامنے آئے ہیں، ان میں سارا زور موشگافی اور فقط الفاظ و تراکیب کی صوفیانہ حد تک مبہم تشریح پر ہے، اسی طرح ہیئت ادب کی ترکیب کا

جو تجزیہ عام طور پر مغرب میں کیا جاتا ہے، اس میں چند مفروضات کی بنیاد پر کھینچ تان کر مطلوبہ نتائج نکالنے کا میلان زیادہ ہے اور پوست کندہ حقائق کی دریافت کا رجحان کم، چنانچہ اس کے باوجود کہ چند مشہور مغربی نقادوں نے اپنی تشریحات و مطالعات کی بنا بعض جدید علوم کے انکشافات پر رکھی ہے واقعہ یہ ہے کہ انکے یہاں سب سے زیادہ کمی علم ہی کی ہے، اور وہ بالعموم اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ ان کے منتخب کردہ ادبی نمونے اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں، لہٰذا وہ مستقل بالذات وجود ہیں جنکی تشریح الابدان پر توجہ مرکوز کر کے ان کے عناصر وجود اور جمالیاتی اثرات دونوں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے، لیکن مشرقی تنقید کے وہ اعلیٰ نمونے جن کا حوالہ ابھی شبلی کے سلسلے میں دیا گیا ہے، ایک طرف اپنے موضوع کا پورا علمی احاطہ کر کے اس کے تمام متعلقات کا سراغ لگاتے ہیں، اور دوسری طرف ادب کے سالم کارناموں کی بالکل فنی و جمالیاتی تشریح پر سارا زور صرف کرتے ہیں، لہٰذا جو آگاہی کسی ادبی موضوع کے متعلق اعلیٰ پایے کے مشرقی مطالعات سے ہوتی ہے وہ مغربی مطالعات سے کم ہی ہوتی ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ تنقید یا ادب کو مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم کرنا ہی نامناسب ہے، ادب و تنقید کا کارنامہ و مطالعہ خواہ مغرب میں ہوا ہو یا مشرق میں دونوں کی اہمیت ہے اور ان کی قدر شناسی کے لیے بلا امتیاز و تعصب ایک اصولی و آفاقی معیار سے کام لینا چاہیے۔

اس معیار سے جب ہم علامہ سید سلیمان ندوی کے تنقیدی کاموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ وصف و وزن کے اعتبار سے ان کی کاوشیں اپنے وقت کے کسی بھی اردو تنقید نگار سے کم نہیں اور ان کا ایک کام تو ایسا ہے کہ اپنے موضوع پر دنیا کے تنقیدی ادب میں اسی طرح بے نظیر ہے جس طرح ان کے استاد علامہ شبلی کی شعر العجم ہے، یعنی "خیام" پر علامہ سید سلیمان ندوی کی تحقیق و تنقید، اس کے علاوہ ان کے مشہور مجموعہ مضامین "نقوشِ سلیمانی"، میں ان کی تنقیدی

بصیرت متعدد ان مقالوں اور تبصروں سے آشکار ہے، جو انھوں نے متنوع موضوعات پر تحریر کیے ہیں، ان موضوعات میں غزل، نظم، مرثیہ، مکتوب نگاری، ظرافت نگاری جیسی اصناف ادب شامل ہیں، اور جس صنف پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اس کے فنی مضمرات پر بڑی فکر انگیز بحثیں کی گئی ہیں، جن سے باذوق قارئین کے علاوہ خود نقادانِ ادب فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ ایک ایسے عالم کی نکتہ سنجیاں ہیں جس کی تنقیدی حسیات کثیر اور غائر مطالعۂ ادب سے ابھری ہیں، اور وہ اپنی ہر رائے بہت جانچ پرکھ اور ناپ تول کر پیش کرتا ہے، اردو کے بہتیرے موجودہ ناقدین کی طرح فقط اپنی ذاتی پسند و ناپسند اور ذہنی تعصبات یا نفسیاتی میلانات کی بنا پر فتوے صادر نہیں کرتا حالاں کہ خوب و ناخوب کے درمیان قطعی فیصلہ کرنے میں اس کے اسلوب کی محکمی کسی بڑے سے بڑے ناقد سے کم نہیں۔

مثال کے طور پر سب سے پہلے میں علامہ سید سلیمان ندوی کے دو زبردست ادبی معرکوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں تاریخ تنقید کے اہم کارنامے ہیں، اور ناقد کے کمالِ فن کا ثبوت پیش کرتے ہیں، شاد عظیم آبادی کے متعلق مختلف وقتوں میں مختلف قسم کی باتیں اردو کے تنقیدی ادب میں کی گئی ہیں، مگر آج سے چونسٹھ سال قبل علامہ سید سلیمان ندوی نے شاعر کی غزلیات کے صرف پونے دو سو اشعار پر مشتمل ایک غیر منتخب اور نامرتب مجموعۂ کلام کے مقدمے میں جو کچھ کہا تھا اس پر اردو تنقید آج تک کوئی اضافہ نہ کر سکی، بلکہ اس بصیرت انگیز مطالعے کا اتباع بھی نہ کر سکی اور بعض وقت تثلیث غزل، وغیرہ کی لایعنی مبالغہ آرائیوں میں الجھی رہی، اس مقدمے کی روح حسب ذیل پیراگراف میں جلوہ گر ہے:۔

"شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا، لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ کے ارباب کمال سے رہا، تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری پر

لکھنؤ سے بہت زیادہ دلی کا رنگ نمایاں ہے، ان کے کلام میں کہیں کہیں لکھنو والوں
کے صنائع بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے، مگر شاعری کا مذاق، مضامین، معانی خیالات،
سنجیدگی، متانت ہر چیز دلی کا پتہ دیتی ہے، اس کے ساتھ جو چیز شعرائے لکھنو کی ان میں
نظر آتی ہے وہ الفاظ کی صحت، محاوروں کا تتبع اور فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے
ساتھ استعمال ہے، اس طرح ہم عظیم آباد کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت سے
لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہیں گے،، (نقوش سلیمانی ص ۳۹۸)

شاد کے تغزل کی خصوصیت اور اہمیت پر اس سے بہتر تنقیدی تبصرہ ممکن نہیں، اور اس
تبصرے کی خوبی یہ ہے کہ صرف چند جچے تُلے لفظوں میں پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ
عصر حاضر کے ایک عظیم غزل گو کے امتیازی اوصاف کی نشان دہی کر دی گئی ہے، اس نشان دہی
میں تاریخی و عمرانی نکات کے ساتھ ساتھ خالص لسانی و ادبی اشارات بھی ہم آمیز ہیں، یہ ایک عالمانہ
تنقید ہے جو اعلیٰ ذوقِ ادب کے ساتھ کی گئی ہے، اور سر بسر صداقت پر مشتمل ہے، اس میں افراط
و تفریط کا کوئی مبالغہ نہیں، ذاتی پسند و ناپسند اور نفسیاتی الجھن کا کوئی شائبہ نہیں، ایک بالکل
معروضی و متوازن مطالعہ و تجزیہ ہے۔

اس کے علاوہ شاد کی جو خصوصیت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے واضح کی ہے وہی درحقیقت
اردو ادب میں عظیم آباد کے مکتب شاعری کا امتیازی نشان دلی اور لکھنو کے مکاتب کے مقابلے
میں ہے، اور اس سلسلے میں شاد کی حیثیت ایک پورے دبستان کے نمونہ و معیار کی ہو جاتی ہے،
چنانچہ دبستانِ عظیم آباد کا بانی شاعر جو بھی ہو اردو غزل میں اس کے سب سے بڑے نمائندہ
شاد عظیم آبادی اور اس دبستان کو ایک تنقیدی بنیاد فراہم کرنے والے علامہ سید سلیمان ندوی
ہیں، یقیناً یہ ہماری ادبی تنقید کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔

شاد کے سلسلے میں علامہ نے ایک بہت ہی اہم عصری نکتہ ان کے مزاج تغزل کے متعلق اٹھایا
ہے، اور اس نکتے کی تشریح کرتے ہوئے شاد کو عصر حاضر کا میر قرار دیا ہے، زیر نظر مقدمے میں انکا بیان ہے۔

"غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں، حسن
و عشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے، چھوٹے چھوٹے الفاظ میں
سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رقت جو میر ہی کے اوزان و بحور میں وہی انداز
کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے، اس لیے شاد کو اس دور کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے،،

(نقوش سلیمانی، ص ۳۹۹)

ہماری تنقید میں عام طور پر میر کا جانشین فانی کو قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ کی رائے مختلف ہے،
اور نہ صرف یہ کہ شاد کو میر کی جانشینی کے معاملہ میں فانی پر تقدم حاصل ہے، بلکہ علامہ کی رائے کو بھی،
دوسرے ناقدین کے خیالات پر تقدم ہے، شاد کے کلام نے فانی کے اشعار سے پہلے انداز میر کی
عکاسی کی اور علامہ نے دوسرے ناقدین سے قبل دور جدید کے میر کو دریافت کیا، اس سے بھی زیادہ اہم
تنقیدی نکتہ یہ ہے کہ علامہ نے اپنے تنقیدی مطالعے میں میر کی پوری ادبی شخصیت اور اس کے فنی اسلوب
کو پیش نظر رکھا ہے، جب کہ دیگر ناقدین محض میر کی قنوطیت کو سامنے رکھتے ہیں، اور ان کے اسلوب
کو نظر انداز کر دیتے ہیں، میر کے تغزل میں قنوطیت سے زیادہ بھی کچھ تھا، اور ان کے اسلوب میں
وہ شوکت نہیں جو غالب کی خصوصیت اور جس کا عکس فانی کے انداز بیان پر نمایاں ہے بیان میں
رقت، اور فقیرانہ صدا، کی جن خصوصیات کا اشتراک علامہ سید سلیمان ندوی نے میر اور شاد
کے درمیان دکھایا ہے، وہ دونوں شاعروں کے مزاج تغزل کے متعلق پتے کی بات ہے جس کا
سراغ علامہ کی تنقیدی بصیرت ہی لگا سکی، جب کہ دوسرے ناقدین انگریزی محاورے میں صرف
جھاڑیاں پیٹتے رہے۔ Beating about The bush

علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقیدی بصیرت کا دوسرا اہم معرکہ شعلہ طور، کا تعارف کراتے ہوئے ایک نووارد شاعر جگر مرادآبادی کی قدرشناسی ہے، جگر کے پہلے مجموعۂ کلام پر یہ پہلی مبصرانہ تنقید ہے، جس میں اردو غزل کی بساط پر ایک تازہ وارد کا ایسا شاندار استقبال کیا گیا ہے، جو عصر حاضر میں اردو غزل کے مستقبل کے ایک روشن پہلو کی نشاندہی کرتا ہے آج سے نصف صدی پیشتر جگر جیسے غزل گو کی یہ قدرشناسی تنقید کی دوربینی بلکہ پیش بینی کا ثبوت ہے ..... اور اس سے ایک بار پھر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا ذوقِ ادب کتنا اعلیٰ اور تنقیدی شعور کتنا گہرا تھا، اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر یہ حقیقت ہے کہ جگر کی شاعری کے جو اوصاف علامہ نے تقریباً پچاس سال قبل بیان کیے تھے، وہی اردو کے اس منفرد و ممتاز غزل گو کی حقیقی توصیف کرتے ہیں، اس توصیف کی انصاف پسندی ملاحظہ ہو۔

"جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں، وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر جب وہ کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق یہی ہوتا ہے، کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں، اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے، اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔" (نقوش سلیمانی، ص ۲۳۰)

ان سادہ وصاف جملوں میں جگر کی تعریف ان کی شاعری کی اصلیت کے مطابق ہے، جسے بلا کم و کاست بیان کر دیا گیا ہے، یہ اصلیت فطری شاعری کی ہے، جس میں تمام حقیقی شاعروں کو شریک و رفیق بتایا گیا ہے، چنانچہ اسی سلسلے میں علامہ نے جگر کو حافظ اور خیام کے مشابہ قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں۔

"فارسی غزل کا بہترین نمونہ حافظ کا کلام ہے، مگر اس کو ہر صاحب نظر محسوس کرتا ہوگا کہ حافظ کے خیالات میں نیرنگی نہیں، طرز بیان میں نیرنگی ہے، وہی چند بندھے ہوئے خیال ہیں جو حافظ کی ہر غزل میں ظاہر ہوتے ہیں، مگر ہر غزل اپنے طریقِ اظہار اور طرز تعبیر میں الگ ہے، ایک ہی خیال سو سو طرح اس میں ادا ہوتا ہو مگر ہر جگہ اس کی شان نرالی اور طرز نئی ہے، یہی حال خیام کی رباعیوں کا ہے، چند خیالات ہیں جو ہر دفعہ نیا قالب بدل کر اور نئی شکل میں جلوہ گر ہو کر سامنے آتے ہیں۔"

حافظ و خیام سے جگر کا یہ موازنہ علامہ نے تینوں شعرا کے احوال و کیفیات کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے، واقعہ یہی ہے کہ مستی و سرشاری میں اگر کسی اردو شاعر کا کلام حافظ و خیام کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے، تو وہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جگر ہی ہیں، علامہ خود فرماتے ہیں:

"وہ (جگر) مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر آتا ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنائی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں، تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔" (نقوش سلیمانی، ص ۲۳۱)

یہ اردو میں تاثراتی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے، اس میں علامہ کی تنقیدی نگاہ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، اور اس کے تغزل کی تہوں میں غوطہ لگا کر اس کا گوہر آبدار نکال لاتی ہے، پھر اس گوہر کی آب و تاب کو ویسے ہی درخشاں الفاظ میں بیان کرنے کے لیے ناقد کا قلم گویا شاعر کا قلم بن جاتا ہے، یہ درحقیقت روح شاعری میں حلول کر کے اس کے عمیق ترین مضمرات کی تشریح کا کمال ہے، اس تشریح کی تکمیل حسب ذیل جملوں سے ہوتی ہے۔

"جگر مستِ ازل ہے، اس کا دل سرشارِ الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے
اور عشقِ حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانہ کی گلی سے
کعبہ کی شاہراہ کو اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزمِ ساقیِ کوثر
تک پہنچنا چاہتا ہے" (نقوشِ سلیمانی)

یہ الفاظ "شعلۂ طور" سے زیادہ "آتشِ گل" کے شاعر کے ذہن کی تصویر پیش کرتے ہیں اس کا
مطلب یہ ہے کہ ناقد نے پہلے ہی مجموعۂ کلام کے متعدد اشعار کے اشارات سے سمجھ لیا کہ آگے چل کر شاعر
کی منزل کیا ہوگی، جس کا نقشہ واقعی دوسرے مجموعۂ کلام کے اشعار سے بالکل نمایاں ہو جاتا ہے اس طرح
شاعر کی کیفیات کا رخ جان لینا یقیناً ایک زبردست تنقیدی بصیرت کا ثبوت ہے اس معاملے
میں سب سے لطیف نکتہ یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے جب یہ الفاظ لکھے تھے تو وہ یہ بھی
سمجھتے تھے کہ ممکن ہے، از خود رفتگی میں شاعر کو خود معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر جا رہا ہے، چنانچہ اس سلسلے
میں علامہ کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پر خمار، مگر اس کا دل
ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے
کلام میں اثر نہ ہو" (ایضاً)

یہ ایک بے خود نظری شاعر کا تنقیدی مرقع ہے، اور اس سے جگر کے سرور انگیز اور معنی آفریں
تغزل کی وہ حقیقت آشکار ہوتی ہے، جس کے فہم سے ان کے متعدد معاصرین قاصر رہے، خاص کر
نیاز فتح پوری کے تو تنقیدی حواس ہی جگر کے کلام سے مختل ہو گئے، اور انھوں نے اپنے وقت کے
ایک رئیس المتغزلین کی تحقیر و توہین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن جگر کی شاعری تاریخ
ادب میں اپنا مقام پا چکی ہے، جب کہ نیاز فتح پوری کی تنقید اب گویا کسی کو یاد بھی نہیں۔

اکبر الٰہ آبادی کے ظریفانہ کلام پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلے میں نقادوں نے بڑی
افراط و تفریط کی ہے، اور کم ہی ایسے ہیں جنھوں نے اکبر کے فکر و فن کے عناصر و حقائق پر جامع بحث
کی ہو، علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اس موضوع پر بھی ایک قول فیصل ہے، ملاحظہ ہو

"میر صاحب (میر اکبر حسین) کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدیؒ ابن یمین
اور خیام کے مغزِ سخن کو، آمنت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا ہے
کہ وہ نہ صرف تفریحِ طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت،
اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث بھی نظر
آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور
قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب
اسی بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوقِ کلام کو لطف دیتے ہیں۔ (نقوشِ سلیمانی ص ۱۶۵)

یہ نکات وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو بیک وقت اردو و فارسی ادبیات کی پوری تاریخ سے
آگاہ اور اکبر کے عظیم شاعرانہ آرٹ کا ادا شناس ہو۔ یہ ایک بہت ہی باخبر اور صاحب نظر
تنقید نگار کے نکات ہیں، اور ذوق و شعور کے رسوخ و رسائی کا بہترین نمونہ، اس سے اکبر کے ذہن
اور فن دونوں کے پیچ و خم بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

مسدسِ حالی پر اردو تنقید کا ایک پورا سرمایہ جمع ہو چکا ہے، اب دیکھیے کہ ۱۹۳۵ء
میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جو فکر انگیز جائزہ اس طویل تاریخی نظم کا لیا ہے، اس میں خاص
شعریت کے یہ بصیرت افروز نکتے انھوں نے پیش کیے اور اس طرح موضوع کے ساتھ ساتھ
اسلوب کی اس تاثیر کا بھی راز کھولا جو مسدسِ حالی کی مقبولیت کا سبب ہوئی۔

"اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس

اس زمانہ میں دلسوخت کے لیے پھر اہل بیت کرام کے دلدوز مصائب اور شہید کربلا کے دل فگار سوانح کے بیان کے لیے یک گونہ مخصوص ہو کر غم والم کی داستاں سرائی کے لیے خاص ہوچکا تھا، اس لیے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا تو اس مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی جس کا وزن ہی گویا درد وغم اور نالہ و ماتم کے لیے بن چکا تھا۔ (نقوش سلیمانی ص ۴۲۹)

اسی طرح مسدس کی سادگی و پرکاری پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ رقم طراز ہیں۔

"اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف وشفاف نہر کسی ہموار ترائی میں آہستگی سے بہتی چلی جارہی ہے، نہ کہیں رکاوٹ ہے، نہ لفظ میں گرانی ہے، نہ قافیہ کی تنگی ہے، زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے، ہماری زبان میں سہل ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے۔"

یہ تو شاعری کے سہل ممتنع کا بیان ہوا، اگر تنقید میں بھی کسی سہل ممتنع کا تخیل قائم کیا جائے تو علامہ سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا جملے نثر میں تنقید کے سہل ممتنع کی بہترین مثال بہ آسانی قرار دیئے جاسکتے ہیں، یہ تو اسلوبیات پر سید صاحب کی پرمغز نکتہ سنجی کا ایک نمونہ ہوا، اب اسی مسدس کے سلسلے میں اجتماعی نفسیات پر علامہ کے تبصرے کا انداز ملاحظہ ہو۔

"مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثۂ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کیے تھے جن کو سن کر ان بے خبروں کو جن کو دفعتہً ۱۸۵۷ء کے حادثۂ خونیں کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر

ان کی حیرت کو دور کیا اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں، زندگی تعجب انگیز تھی۔ (نقوش سلیمانی، ۷-۴۴۶)

یہ تنقید کی جامعیت ہے کہ ادب کے موضوع اور اسلوب دونوں کو مدنظر رکھ کر کسی نمونۂ ادب کی ایسی تشریح وتوصیف کی جائے جس سے فکر وفن کی باہمی ترکیب اور ہم آہنگی کے عناصر انداز، مضمرات اور اثرات واضح ہوں، یہ جامعیت ہی اچھی اور بڑی تنقید نگاری کا جوہر اصلی ہے، جو بہت کم یاب ہے، اور چند عظیم ناقدین ہی اس کے مایہ دار ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی اپنی قوت تنقید کے لحاظ سے انہی میں ایک ہیں۔

علامہ کا نظریۂ تنقید ان کے متعدد مضامین میں نمودار ہوا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص نقطۂ نظر سے ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کا تجزیہ، موازنہ اور فیصلہ کرتے ہیں، یہ ایک مرکب ومتوازن نقطۂ نظر ہے، جس میں فن کی جمالیات کے ساتھ ساتھ فکر کی اخلاقیات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، اور بالکل اصولی طور پر متنوع ادبی تخلیقات کی منصفانہ قدرشناسی کی گئی ہے، ایک غیر معروف اردو شاعر محمود اسرائیلی کے مجموعۂ کلام خیاباں، پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے شاعری کے متعلق اپنے جن تصورات کا اظہار کیا ہے، ان کے مطالعے سے علامہ کی تنقیدی فکر کے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں، یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا، میں سمجھتا ہوں کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا، اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفریں عہد پیدا نہ کرتی تو رستم و سہراب اور کیکاؤس و افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچوں میں یہ جان نہیں پڑ سکتی تھی، اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نہیب، تلواروں کی یہ جھنکار اور داد شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان وقلم سے ادا ہوسکتے تھے۔ (نقوش سلیمانی ص ۴۵۶)

۲۔ شاعری کے لیے جس عشق کی ضرورت ہے اس سے مقصود صرف لیلیٰ اور مجنوں میں عشق نہیں ہے، یہاں عشق اپنے وسیع معنوں میں بولا جارہا ہے، اس سے قلب کی وہ واقعی کیفیت مراد ہے جو عالم اور ماورائے عالم کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا کرسکتی ہے، مناظر فطرت سے عشق ہوسکتا ہے، قوم اور ملک سے عشق ہوسکتا ہے، کسی بلند مقصد اور اہم مطمح نظر سے عشق ہوسکتا ہے، کسی مقدس ذات اور مقدس کام سے عشق ہوسکتا ہے، اور اس میں سے ہر عشق شاعری کے ساز کو چھیڑ کر اس کو دہن موسیقا بنادیتا ہے، (نقوش سلیمانی ص۵۷)

۳۔ ملک اور دین کی خدمت میں جو تضاد بعض کم سوادوں کو نظر آتا ہے، اس کی گہری نگاہ میں وہ منطقی مغالطہ کے سوا کچھ اور نہیں، غرض اس باب میں اس کے خیالات و تعلیمات بے حد سنجیدہ ہیں، یعنی مذہب وسیاست اور دین و وطن کے جذبات کی معتدل آمیزش، مشرق سے صحیح عقیدت اور مغرب کی صحیح تنقید (نقوش سلیمانی ص۴۶)

ان اقتباسات کی روشنی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نظریۂ تنقید کے متعلق جن چند امور پر زور دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں۔

اول، ادب اپنے مخصوص تکوینی مفہوم میں بجائے خود براہ راست کوئی تہذیب اور نظام اقدار پیدا نہیں کرتا، لہٰذا وہ نہ اپنا محرک آپ ہوسکتا ہے نہ اپنا مقصود آپ یعنی ادب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اور اپنے معاشرے کا عکاس، تاریخ ادب کے ساتھ نہیں چلتی، ادب تاریخ کے ساتھ چلتا ہے، شاعری، افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید سبھی اصناف ادب کو تحریک اس اجتماعی فضا سے ملتی ہے، جس میں کوئی ادیب یا شاعر سانس لے رہا ہوتا ہے، لہٰذا فن کار کی عظمت اس امر میں مضمر ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے حقائق کو پوری طرح محسوس

کرکے ان کی اچھی طرح عکاسی کرے، تاکہ اس کا فن روحِ عصر کا آئینہ دار اور ترجمان ہو، سماج میں اس کی قدر وقیمت ہو اور تاریخ میں اس کی جگہ بن سکے، اس لیے کہ ادب کا ہر نمونہ کسی روایت کے پس منظر میں رونما ہوتا ہے، اور وہ اپنی کوئی روایت اسی وقت بنا پاتا ہے، جب ورثے میں ملی ہوئی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں کچھ توسیع واضافہ کرے اور اسے ترقی دے۔

دوم، ادب کا موضوع بہت وسیع اور رنگارنگ ہوتا ہے، ادبی کوشش میں کامیابی کے لیے شرط اس موضوع سے ذہنی وابستگی، اس کا فہم واحساس اور اس کے اظہار کے لیے ایک جذبہ بے اختیار ہے، عشق محض ذات کا نہیں، کائنات کا بھی ہوتا ہے، اور کائنات بہت وسیع ہے، فرد، معاشرہ، قوم، ملت، دین، تہذیب اور فطرت سبھی اس میں شامل ہیں، لہٰذا ادیب وناقد دونوں کی نگاہوں میں وسعت اور قلب میں کشادگی ہونی چاہیے حسن کی تعریفیں بھی بہت ہیں اور مظاہر بھی فراواں، حسن کو ہر رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت ہی ایک شاعر یا ادیب کے ذہن کی سب سے بڑی پونجی ہے، اور یہی اس کے احساسِ جمال کی کسوٹی بھی۔

سوم، ادب زندگی کے لیے ہے، اور تمام مسائل حیات اس کا مواد، سیاست اور مذہب دونوں اس کے دائرے میں ہیں، اور مشرق ومغرب دونوں سے اس کی یکساں دلچسپی ہونی چاہیے، چنانچہ ادب کے ذریعے دین اور وطن دونوں کی خدمت ایک ہم آہنگی سے کی جاسکتی ہے، اس لیے کہ وطن دوستی اور دین داری کے درمیان اصلاً کوئی تضاد نہیں ہے، یہ ایک قسم کی وسیع تر انسانی یک جہتی ہے، جو ہر قسم کے تفرقوں پر حاوی ہے، اور زندگی کو ایک رخ دینے والی ہے،

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے یہ ادبی تصورات تنقیدی شعور کی بلند ترین منزل کے نشانات ہیں جن کا اتباع کرکے ہماری جدید تنقید متعدد گم راہیوں سے نکل کر راہ مستقیم پر گام زن ہوسکتی ہے، اس لحاظ سے ہم علامہ کو عصر حاضر کا ایک مصلح تنقید کہہ سکتے ہیں، اور ان کے ادبی رہنما ہونے میں

تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ ان کی اس ادبی رہبری کی سب سے بڑی دستاویز اور اردو میں تحقیق و تنقید دونوں کا سنگ میل ان کا شاہکار خیام ہے، ادبی تحقیق کی صنف میں خیام سے بہتر کوئی کتاب آج تک اردو میں نہیں لکھی گئی، اور یہ تحقیق تنقید کی بہترین حیات کے ساتھ کی گئی ہے، اس میں ایک طرف تمام متعلقہ اعداد و شمار اور جملہ ضروری حقایق کا احاطہ ہے یہاں تک کہ موضوع سے متعلق دنیا کی تمام زبانوں میں پیش کیے گیے تازہ ترین مواد کا جایزہ ہے، جب کہ دوسری طرف رباعیات خیام کی تشریح و تفہیم، علمی تنقیدی انداز سے کی گئی ہے اور ان کی صحیح قدر و قیمت کی تعیین کے لیے ایک بے خطا اور بے مثال تجزیے سے کام لیا گیا ہے۔

"خیام، وہ عہد آفریں کتاب ہے، جس نے فارسی کے اس مشہور رباعی گو کے متعلق مشرق و مغرب دونوں کے پھیلائے ہوئے تمام غلط تصورات کو چیلنج کیا، اور اعداد و شمار کی فراوانی کے ساتھ ساتھ تجزیے کی طاقت سے اپنے صحیح نقطۂ نظر کا لوہا منوا لیا، یہاں تک کہ علمائے عصر کو اقرار کرنا پڑا کہ خیام پر اس سے بہتر کتاب نہ پہلے کبھی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی، نہ آیندہ متوقع ہے، اس لیے کہ اس کے مباحث نے موضوع کے تمام مضمرات کا استقصا کر کے ایک قول فیصل پیش کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے خیام کو بحیثیت ایک عظیم فلسفی صوفی کے نئی زندگی عطا کی اور اس کی رباعیات کی حقیقت و اہمیت پہلی اور آخری بار مکمل طور پر واضح کر دی، اس سلسلے میں خود رباعی کی اصلیت کا سراغ لگا کر علامہ نے دکھایا ہے کہ خیام ہی نے صحیح معنوں میں اس ہیئت سخن کا بہترین استعمال کیا اور اس کے دونوں اساسی عناصر فلسفہ و تصوف کو باہم ترکیب دے کر ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ کر دیا، جس سے رباعی کے مفہوم میں بہ یک وقت بلندی اور گہرائی دونوں آگئی، حسب ذیل مختصر اقتباسات سے زیر نظر تصنیف کے کارنامہ و کمال کا کچھ اندازہ ہوگا۔

"وہ خیام ہی ہے، جس نے باقاعدہ اس رباعی سے فلسفہ و حکمت کے بیان کا

کام لیا، اور اس کے بعد اس کے طبقہ نے اس کی تقلید کی، میرے نظریہ کے مطابق رباعی پہلے اہل سرود کے یہاں آئی، ان کے یہاں سے صوفیہ کی مجلس سماع میں اور وہاں سے حکما کے حلقۂ درس میں، اور خیام پہلا حکیم شاعر ہے، جس کی رباعیوں کی قدر ہوئی اور وہ اس کی شہرت کا ذریعہ ہوئیں"۔　(صـ ۲۵۰)

صوفیوں نے اُس (خیام) کی رباعیات میں صوفیانہ رباعیوں کی آمیزش کی، اور رندوں نے اباحی خیالات اور مستی و رندی کی رباعیاں بڑھائیں، چنانچہ ان مشکوک رباعیات میں انہی دو قسموں کی رباعیاں کثرت سے ملیں گی، ایک اس کو صوفی صافی یعنی مذہبی صوفی ثابت کرنا چاہتا ہے، اور دوسرا رند لااُبالی، مگر در حقیقت خیام نہ یہ تھا، نہ وہ، بلکہ وہ حکیم متقشف تھا، اور اس کا تصوف اگر تھا تو حکیمانہ تصوف تھا، مذہبی صوفیانہ نہیں"۔　(صـ ۲۷۱)

"خواجہ حافظ کی طرح دنیا میں کتنے خوش قسمت بادہ پرست ہیں، جن کی شراب کو لوگوں نے شراب معرفت سمجھا ہے، لیکن ایک بد قسمت خیام ایسا ہے کہ اس کی شراب کو دوست و دشمن سب ہی بھٹی والی شراب سمجھتے ہیں، اور انہوں نے یہ تصور کیا ہے کہ وہ ایک رند میخوار تھا، جو ہمیشہ مست و سرشار رہتا تھا، جس کے ادھر اُدھر ٹوٹی صراحی اور پھوٹے پیالوں کے ٹکڑے پڑے رہتے تھے، مگر کیا واقعہ ایسا ہی ہے؟　(نقوش سلیمانی صـ ۳۳۱)

یہ فیصلہ مشکل ہے کہ خیام جب شراب کا متوالا تھا، وہ کون سی شراب ہے، اس کے ساتھ اس مقدمہ کو بھی شامل کیجیے کہ خیام کے جس قدر قدیم اور مستند سوانح نگار ہیں ان میں سے کسی نے خیام کی بادہ پرستی و میخواری کا ذکر کیا معنی اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ . . .

خیام کے میکدہ سخن میں شراب کی جتنی بوتلیں ہیں، صاحب ذوق کی نظر اندازہ کرتی ہو کہ وہ یکساں نوعیت کی نہیں ہیں۔ ...... (نقوش سلیمانی ص ۳۴۶)

اس موقع پر ایک اور نکتہ ہے، جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، شاعر کے شعر میں ایسی لچک ہوتی ہے، کہ جس مذاق کا آدمی جس خیال کو دل میں رکھ کر پڑھتا ہے اس کے مطابق معنی اس شعر میں اس کو نظر آتے ہیں، خواجہ حافظ کے ایک ہی شعر میں ایک میخوار کو رندی کی تعلیم، اور ایک پیر طریقت کو زہد و ترک کا سبق ملتا ہے، یہی حال خیام کی ان رباعیوں کا ہے۔ (نقوش سلیمانی ص ۳۵۰)

ان تحقیقی و تنقیدی مباحث کے بعد کتاب کے آخر میں سید صاحب نے رباعیات کے علاوہ خیام کے بعض عربی و فارسی علمی رسائل کی تالیف و ترتیب انہی زبانوں میں کی ہے، جب کہ مباحث کے دوران وہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی ماٰخذ کے حوالے کثرت سے دیتے ہیں اور خیامیات کے تمام علما کی رایوں پر پورے اعتماد و استناد کے ساتھ محاکمہ کرکے اپنے قطعی فیصلے صادر کرتے ہیں، کسی ادبی موضوع پر ایسی معرکہ آرا کتاب شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہو، اردو یقیناً خوش قسمت ہے کہ اس کے سرمایے میں تحقیق و تنقید کا یہ نادر و نایاب جوہر پایا جاتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اسلوب نگارش صاف، صریح، پُرمعنی اور شگفتہ ہے، جیسا محولہ بالا اقتباسات سے مترشح ہے، عربی و فارسی کے بہت بڑے عالم ہونے کے باوجود سید صاحب کی عبارت میں فقاہت جتنی بھی ہو، ثقالت بالکل نہیں، ان کے الفاظ ثقیل نہیں، دبیز نہیں ان کے جملے پیچیدہ نہیں، تراشیدہ ہیں، ان کے بیانات پُرپیچ نہیں سلیس ہیں، ان کی ترکیبوں میں کوئی اغلاق نہیں اور تشبیہیں اشکال سے خالی ہیں، فقروں کی دروبست چست ہے، اور استعارات و کنایات نہایت واضح، سید صاحب کی نثر کا رنگ شستہ اور آہنگ رواں ہے، اس طرز تحریر میں شائستگی بھی ہے

اور چاشنی بھی۔ سید صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر نکتہ ایک منطقی انداز سے اور مدلل طور پر پیش کرتے ہیں، اپنی بات مثالوں اور حوالوں سے ثابت کرتے ہیں، لیکن فقیہ شہر کی طرح لغت ہائے حجازی کی قارونی کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ ایک خوش مزاج صوفی کی طرح بڑے دل پذیر اسلوب سے اپنے موقف کو قاری کے لیے دل نشین بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تحقیق کی ساری خشکی ادب کی شادابی میں بدل جاتی ہے، اور تنقید کی صلابت ایک لطافت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے۔

یہ شبلی کے دبستان تنقید کا ایک امتیازی جوہر ہے، جس کو عصر حاضر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ساتھ اور کہنا چاہیے کہ ان کے زیر سرکردگی عبدالسلام ندوی، نجیب اشرف ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور اب سید صباح الدین عبدالرحمان نمایاں کرتے رہے ہیں، یہ ایک علمی دبستان ہے، مگر تنقیدی حیات اور ادبی محاسن کا بھی مایہ دار ہے، یہی وجہ ہے کہ جن ادبی موضوعات پر اس دبستان کے عمایدین نے قلم اٹھایا ہے اس کی جمالیات و اخلاقیات دونوں کا ایک ایسا مرقع تیار کر دیا ہے، جس سے معلومات کے حصول کے ساتھ ساتھ احساسات کی تحریک کا بھی سامان ہوتا ہے، اور موضوعات کی تمام جہتیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ محض تنقید کا خام مواد نہیں، وہ پختہ و بالیدہ کارنامہ ہے، جس نے کئی ادبی نسلوں کے ذوق کی پرورش اور شعور کی تربیت کی ہے شبلی و سلیمان اور ان کے رفقا نے اردو ادب میں مستند، متین اور موثر افکار و خیالات کی ایک فضا بنائی ہے، جس سے وقت کے ادبا و شعرا نیز عام قارئین نے بہ کثرت استفادہ کیا ہے، شبلی کی شعر العجم کے ساتھ ہی سید سلیمان ندوی کی خیام نے اپنے معاصر اردو ادب میں فارسی شاعری کے ساتھ اہل ذوق کے شغف میں اضافہ کیا اور انھیں اس کے مطالعے کا زیادہ سے زیادہ شوق دلایا، یہ اردو شاعری کی بنیادی روایات کو زندہ و تابندہ رکھنے کا کارنامہ تھا، اور جدید اردو ادب نے جس حد تک اس سے بے اعتنائی

برتی ہے، اپنا اتنا ہی نقصان کیا ہے،

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ شبلی و سید سلیمان ندوی کے تنقیدی کمالات کی تاریخی عظمت کے علاوہ ان کی علمی اہمیت کو بھی سمجھا جائے، اور ان سے بیش از بیش استفادہ کرکے جدید اردو ادب و تنقید کی راہیں ہموار اور ان کا رخ درست کیا جائے، یہ درحقیقت اپنی تنقیدی روایات سے قوت حاصل کرکے انفرادی تجربات کے راستوں پر مضبوط قدموں اور روشن نگاہوں کے ساتھ گام زن ہونا ہے، آج کے ادب میں مشرق کی بازیافت کے لیے شبلی و سید سے بہتر کسی مصنف و ناقد کی تحریریں نہیں ہوسکتیں، اس معتبر بازیافت سے مغرب کا بھی صحیح مصرف دریافت ہوگا، ادبی توازن کے قیام اور متوازن ترقی کے لیے یہ بازیافت و دریافت دونوں ہی ضروری ہیں۔

نوٹ۔ یہ مضمون حضرت سید صاحب کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب میں بہار اُردو اکاڈمی میں پڑھا گیا۔

بزم رفتگاں

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں، اور سیاسی و قومی رہ نمایوں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، جن سے ان کو محبت اور عقیدت اور گوناگون مراسم و تعلقات تھے۔

حصہ اول میں جو مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے شائع ہوا ہے، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالسلام ندوی جیسے حلقۂ شبلی کے ارباب کمال و اصحاب قلم پر مضامین ہیں، اور حصہ دوم میں جو معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپا ہے، مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مشاہیر و اکابر پر مضامین ہیں۔

از۔ سید صباح الدین عبدالرحمن۔

قیمت۔ علی الترتیب ۱۸ روپیے

ہندوستانی جامعات میں عربی کی درس و تدریس
ایک مطالعہ

از جناب فیضان اللہ فاروقی لکچرار شعبۂ عربی سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد۔

ہندوستان میں عربی زبان کب اور کیسے آئی، یہ ایک تاریخی بحث ہوگی، ہماری بات وہاں سے شروع ہوتی ہے، جب یہاں عربی زبان آچکی تھی۔

اہل ہند نے اسے ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے قبول کیا تھا، چنانچہ اسلام کی زیادہ تر تعلیمات مثلاً فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کی تعلیم عربی پر منحصر تھی، کیونکہ یہ تمام علوم عربی میں تھے، اور یہ بھی تھا کہ عربی پڑھنا پڑھانا حدیث کی رو سے باعث اجر و ثواب سمجھا جاتا تھا، جو بلاشبہ ایک حقیقت ہے، لیکن اس کا دارومدار نیت پر ہے، فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان کے حکمران تھی، کیونکہ دہلی سلطنت کے تمام حکمران ایران و افغانستان کے باشندے تھے، اور فارسی انکی مادری زبان تھی، (عموماً ایسا ہی تھا)، بعد میں ان نو واردین کا میل جول جب مقامی لوگوں سے ہوا تو ایک تیسری زبان نے جنم لیا جسے بعد میں اردو کہا گیا، اردو مقامی زبانوں کی بنسبت فارسی اور عربی سے زیادہ متاثر ہوئی، لیکن عربی کا اثر فارسی کی بنسبت زیادہ، اس طرح رہا کہ فارسی نے ایران پر تسلط کے بعد عربی الفاظ کثیر تعداد میں اپنے اندر جذب کرلئے تھے، چنانچہ اردو نے فارسی سے جو کچھ اخذ کیا وہ بھی دراصل عربی ہی کے سرچشمے سے تھا، لیکن جو الفاظ فارسی کے توسط سے آئے وہ فارسی قواعد اور ایرانی تہذیب کے پس منظر میں لیے گئے اور وہ الفاظ جو براہ راست

عربی سے لئے گئے ہیں انھیں حالات اور زبان کے اور زبان کے تقاضوں کے تحت مقامی رنگ دیدیا گیا۔ آسانی کے لیے اس کی کچھ مثالیں دیکھئے۔

لفظ	عربی استعمال	فارسی استعمال	اردو استعمال
غریب	اجنبی ۔ مسافر	اجنبی	مفلس
شراب	پینے کی چیز	مئے ۔ شراب	شراب ۔ مئے
تشریف	عزت افزائی کرنا بحیثیت مصدر متعدی	تشریف بحیثیت اسم جامد	ایضاً
دولت	غلبہ گھومنے والی چیز یعنی حکومت	ریاست ۔ جائیداد	مال
تسکین	غیر متحرک بنا دینا آباد کاری	دلاسہ ۔ اطمینان	ایضاً
تعریف	توضیح ۔ شناخت کرا دینا توصیف ۔ مدح سرائی	تعریف بمعنی	تعریف بمعنی مدح اور شناخت
انتقال	ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا	” ”	مرجانا ۔ سفر آخرت
تعلق	چپک جانا (ربط)	لگاؤ ۔ نسبت	ایضاً
اخبار	خبر کی جمع	خبر نامہ	روزنامہ
خط	لائن	بمعنی مکتوب ۔ لکیر	چٹھی
مجال	جولانگاہ (دائرہ کار)	طاقت ۔ حوصلہ، ہمت	طاقت
ہجوم	حملہ	بھیڑ ۔ اژدہام	بھیڑ

لفظ	عربی استعمال	فارسی استعمال	اردو استعمال
غلام	لڑکا	غلام ۔ عبد	عبد ۔ زرخرید
محل	اترنے کی جگہ ۔ مقام	قصر ۔ جا	قصر
جہاز	آلہ ۔ سامان	جہاز	جہاز
عورت	شرمگاہ	”	عورت (جنس)

یہ اور اسطرح کے اور بہت سے الفاظ ایسے مل جائیں گے، جو اپنی اصل سے ہٹ کر استعمال ہونے لگے ہیں یہ تبدیلی فارسی کے توسط سے ہوئی ہے، یہاں آپ ڈکشنری کی بات اس لئے نہ کریں کہ میں کثرت استعمال کی بات کر رہا ہوں، مذکورہ الفاظ کے معنی اردو ڈکشنری میں عربی مفاہیم کے ساتھ مل سکتے ہیں، لیکن استعمال ہرگز ان تمام معنوں میں نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جن پر ہندوستانی زبانوں کا اثر ہے، بہرحال ہوا یہ کہ عربی کا ہندوستانی طالبعلم جب ان الفاظ کو عربی ادب میں دیکھتا ہے، تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ یہ لفظ وہ پہلے ہی سے جانتا ہے، لیکن جب وہ انھیں استعمال کرتا ہے، تو بالکل مقامی معنوں میں استعمال کر دیتا ہے،

جنوبی ہند کی زبانوں پر عربی کا اثر کس حد تک ہے، یہ مجھے بہت کم معلوم ہے، لیکن شمالی ہند کے عربی طلبہ بنگال سے لیکر گجرات تک عموماً اردو جانتے ہیں، اور اردو کے توسط سے یہ غلطی کرتے ہیں، گجراتی زبان میں بجائے خود کم از کم چالیس فیصد (۴۰٪) الفاظ فارسی کے ہیں جو عربی سے آئے ہوئے ہیں۔

عربی زبان کی درس و تدریس اور ترجموں میں سب سے زیادہ لغزش اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ شراب کے ہندوستانی ترجمے ہی نے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر رہا ہے کہ جنت میں شراب ملے گی، حالانکہ قرآن نے جس شراب کا ذکر کیا ہے ذخیرہ پانے کے لیے نہیں ہے،

بلکہ صرف پاک مشروب کے معنی میں ہے، الفاظ کا مقامی استعمال صرف معانی کی حد تک نہیں ہے۔
بلکہ جنس پر بھی اس کا اثر ہے، بہت سے الفاظ عربی میں مونث استعمال ہوتے ہیں، لیکن اردو میں
مذکر ہیں، اور اس کے برعکس بہت سے مذکر مونث ہو جاتے ہیں، چنانچہ۔ کرسی، قلم، کتاب، علم
دعا، دوا، قمیص، تعریف، توصیف، میزان، منزل، تخلیق، مخلوق، فکر، موج اور اصطلاح
کے کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں، جو اردو میں مونث استعمال ہوتے ہیں، جب کہ عربی میں یہ تمام مذکر
ہیں، اور اس کے برعکس مدرسہ، کلمہ، مکتبہ، داخلہ، نکرہ، معرفہ، فاصلہ، فیصلہ، اخبار، افکار
وظیفہ، اخلاق، نفس وغیرہ، عربی میں مونث استعمال ہوتے ہیں، اور اردو میں مذکر، عربی کا ہندوستانی
طالب علم (میری مراد ان طلبہ سے ہے، جو اردو جانتے ہیں)، یہاں بھی لغزش کرتا ہے، اور
تذکیر وتانیث کی ادنی سی غلطی کر کے ایک عرب کے سامنے اپنی عربی دانی کی حیثیت مجروح
کر لیتا ہے، تیسری بار وہ حروف کے استعمال میں لغزش کرتا ہے، حروف یعنی صلہ کا استعمال
ہر زبان میں اہمیت رکھتا ہے، اور بہت نازک ہوتا ہے، اسی پر زبان کی بنیاد ہوتی ہے،
عربی زبان صلات کے استعمال میں بہت شدت پسند ہے، ادنی سی لغزش معنی بدل کر رکھ
دے گی، یہ ایک الگ بحث ہے، جسے کسی اور وقت چھیڑا جاسکتا ہے، یہاں اردو کے اثر سے
عربی کے استعمال میں غلطی کرنے کی چند مثالیں دیتا ہوں۔

اردو حرف	اردو فعل	عربی فعل	عربی حرف	عربی حروف کے اردو معانی
سے	کہا	قال	ل	لئے
کا	جواب	اجاب	علی / عن	پر ۔ سے
سے	بھر گیا	حفل	ب	ساتھ / سے
میں	بدل گیا	تحول	الی	تک طرف

اردو حرف	اردو فعل	عربی فعل	عربی حرف	عربی حروف کے اردو معانی
میں	بدل دیا	حول	الی	تک / طرف
پر	حیرت کیں	تحیّر	حار فی	میں
سے	پڑھا	درس	علی	پر
سے	پوچھا سوال کیا	سال	×	
کی	نگرانی کی	تفرّج	علی	پر
میں تقسیم	تقسیم ہو گیا	انقسم	الی	تک / طرف
سے	قصہ بیان کیا	قص	علی	پر
کا	ارادہ کیا	قصد	الی	تک ۔ طرف
پر	ایمان لایا	آمن	ب	ساتھ ۔ سے
کی	ناشکری کی	کفر	ب	ساتھ ۔ سے
پر	اصرار کیا	ألح	فی	میں
سے	مر گیا	مات	ب	ساتھ ۔ سے
پر	ختم ہوا	انتھی	من	سے
سے	روایت کی	روی	ا ۔ عن	لئے ۔ سے
(غور) سے	سنا	استمع	الی	تک ۔ طرف

اصل میں اس طرح کی غلطی تعبیرات کی غلطی کا ایک جزء ہے، جو اردو کے ساتھ مخصوص نہیں،

آپ سوچین کسی زبان میں اور لکھین کسی دوسری زبان میں غلطی کا امکان ایک جیسا ہوگا، زبان خواہ کوئی بھی ہو، اور اردو میں انگریزی الفاظ بھی بکثرت در آئے ہیں لیکن اردو کا مزاج فارسی اور عربی سے بنایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے الفاظ ابھی اردو نے اپنے اندر جذب نہیں کئے ہیں، چنانچہ انگریزی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ہم خوب سمجھتے ہیں، کہ یہ لفظ اردو کا نہیں ہے، اس لئے عربی اور انگریزی الفاظ کے اردو میں استعمال کی نوعیت ایک جیسی۔ ۔ نہیں ہے۔ انگریزی الفاظ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کبھی اپنی مادری زبان سے کم علمی کی بنا پر استعمال کرتے ہیں یا کبھی اپنی زبان میں مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مناسب لفظ کی عدم موجودگی اسکا سبب ہوتی ہے، لیکن عام طور پر انگریزی کی ہمہ گیری اس کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے، بلفظ دیگر اپنی بات کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کے لیے ہم انگریزی کا سہارا لیتے ہیں انگریزی کے ہمہ گیر اثرات سے انکار نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تحریری اردو زبان پر ابھی انگریزی کا وہ اثر نہیں ہے، جو عربی کا ہے۔

انگریزوں کے اقتدار کے بعد جب یہاں مغربی طرز کی جامعات وکلیات کا رواج ہوا تو امید تھی کہ عربی زبان وادب کی درس وتدریس پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ لیکن ایسا ہوا، نہیں، علماء کرام نے مذہب کے تحفظ کے پیش نظر مدارس پر اپنی گرفت سخت کردی اور بدقسمتی سے یا پھر ایک خاص پالیسی کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی عام طور پر عربی زبان وادب کا وہی نصاب رکھا گیا، جو مدرسوں میں رائج تھا، سبعہ معلقہ، حماسہ مقامات حریری وغیرہ کے علاوہ آپ مشکل ہی سے کوئی نام پائیں گے، جو یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں مل سکے، ان عصری جامعات کے عربی شعبے عموماً مدرسوں کی ایک شکل نظر آئیں گے کیونکہ طلبہ اور مدرسین کی اکثریت انھیں مدرسوں سے آئے ہوئے، افراد پر مشتمل ہوتی تھی، اور وہ

کتابیں جو وہ مدرسوں میں پہلے سے پڑھ چکے ہوتے تھے، انھیں دوبارہ پڑھکر یونیورسٹی کی ڈگریاں اور پھر سرکاری ملازمت دونوں ہی مل جایا کرتی تھیں، اس صورت حال نے دوطرفہ نقصان پہونچایا، اول یہ کہ طلبہ اور مدرسین دونوں ہی آرام پسند ہوگئے، کیونکہ بغیر محنت کے انھیں امتیازی حیثیت سے ڈگریاں مل سکتی تھیں اور اساتذہ تدریس کی محنت شاقہ سے بچ گئے، دوسری طرف عصری علوم سے یہ حضرات یکسر بے بہرہ ہوتے گئے، اس کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ صرف حصول ملازمت مطمح نظر تھا، نصابی عربی میں اطمنان بخش صلاحیت اس کے لئے کافی تھی مقام کی پستی پر پرواز کو توڑ کر کس طرح ہوا میں اڑا دیتی ہے، اس کی ایک مثال ہماری جامعات میں عربی کی درس وتدریس میں ملتی ہے، یہ کہنے کا شاید مناسب ترین موقع نہیں ہے، اگرچہ زبان پر کسی مذہب کا اجارہ نہیں، لیکن عربی زبان کا مزاج مذہب سے بنایا گیا ہے، اور اس کے پڑھانے والے ہمارے ملک کی جامعات میں عموماً علماء رہی ہیں یا ایسے مسلمان جو کسی نہ کسی طرح مذہب سے وابستگی رکھتے ہیں، اور جب مذہب کی روح اس سے نکال لیجائے گی، تو باقی کیا رہے گا۔ اسے ملاخطہ فرمائیں۔

کچھ طلبہ ایسے بھی تھے، جو عصری کلیات وجامعات کے ذریعہ آگے آئے، اور عربی کو دیگر مضامین کیساتھ بحیثیت ایک مضمون کے پڑھا، انھیں دوسری زبانیں خصوصاً انگریزی تو نسبتاً اچھی آگئی، لیکن عربی میں وہ مدرسوں سے آئے ہوئے طالب علموں کے برابر نہ ہوسکے، کیونکہ مدرسوں سے آئے ہوئے طلبہ کو وہ رسم شاہبازی بھول چکے تھے، لیکن تھے تو شاہین زادے دیگر غیر ملکی زبانیں مثلاً فرنچ وجرمن وغیرہ کی درس وتدریس اور عربی میں یہی فرق ہے کہ عربی پر مذہب اور مدرسوں کا پس منظر چھایا ہوا ہے، جب کہ دیگر زبانیں صرف عصری جامعات وکلیات ہی میں پڑھائی جاتی ہیں، اس لئے ان کے طلبہ اور مدرسین عصری علوم سے بھی آگاہ ہوتے ہیں جب کہ

عربی والے صرف عربی جانتے ہیں، اور اگر عصری علوم سے ان کی واقفیت ہے تو عربی میں ان کی صلاحیت صفر سے کچھ ہی اوپر ہوگی۔ الا ماشاء اللہ، یہی صورتحال تھی کہ اچانک زمانے نے کروٹ بدلی اور عرب ممالک تیل کی دولت سے مالامال ہوگئے تو ایک بار پھر عربی کے چراغ میں تیل بھر گیا، زبان کی قیمت محسوس کی جانے لگی، اور نگاہیں باصلاحیت عربی داں کی تلاش میں بھٹکنے لگیں، ایسا عربی داں جو صرف مولوی نہ ہو بلکہ زمانے کے تقاضوں سے واقف ہو جو ایسی زبان استعمال کرسکتا ہو، جو روزمرہ کی عملی زندگی میں کام آنے والے معانی و مفاہیم کی ترجمانی کرسکے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھ لیا گیا تھا، کیونکہ ابتک تو ہم صرف فرسٹ کلاس میں پاس کرتے یا ہوتے رہے ہیں، راتوں رات اسکو پیدا کرنا کیسے شروع کردیں، مزید وضاحت کے لیے ابھی ہندوستان کو یہیں چھوڑ کر عرب ممالک پہ ایک نگاہ ڈالنی ہوگی۔

عرب ممالک میں فکری انقلاب کی ابتدا ۱۷۹۸ء میں مصر پر نپولین اعظم کے حملے سے ہوتی ہے۔ لیکن ہم بات مختصر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی صورتِ حال تیزی سے بدلنے لگی، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں غیر معمولی رفتار سے ترقی ہوئی، عربی زبان کی ہمہ گیری اور وسعت سے انکار نہیں، لیکن اب زمانے کی باگ ڈور مغرب کے ہاتھ میں تھی، ایجادات و انکشافات وہاں ہو رہے تھے، ان ہی کی زبانوں میں نئے نئے نام اور اصطلاحات کا وجود ہو رہا تھا، دوسری زبانوں کے لیے صرف دو ہی راستے تھے یا تو وہ اپنے اندر وسعت پیدا کریں یا پھر سہل پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے غیر ملکی ایجادات کو مع اُن کے ناموں کے قبول کریں جیسا کہ ہمارے یہاں اردو نے کیا ہے۔ بطور ردِ عمل ساری دنیائے عرب میں شعری انقلاب کے ساتھ ہی زبردست لسانی انقلاب آگیا، اس کا دائرہ کار نہایت وسیع تھا، نثر میں نئے نئے تجربے جن کا تعلق ہیئت اور فکر

دونوں سے تھا، اسی طرح نثر میں نئے اسالیب و انداز سامنے آئے ہم یہاں صرف لغت سے بحث کریں گے، جدید عربی لغت کے پس منظر میں دو الگ الگ نظریئے سامنے آئے ایک یہ کہ زبان میں جو بھی اضافہ ہو وہ خالص عربی کے اپنے مادے سے ہو اور عجمی الفاظ سے عربی کو پاک کرنا ضروری ہے، یہ نظریہ شام اور لبنان میں بہت مقبول رہا، چنانچہ زبان کی وسعت اور عجمیت سے تحفظ کے پیش نظر اکیڈمی اور دار الترجمے قائم کئے گئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ مغربی زبانوں سے آئے ہوئے جدید الفاظ و اصطلاحات کے لیے عربی الفاظ عربی کے اپنے مادے کو وضع کئے جائیں، یہ کام بہت تیزی سے شروع ہوا، عراق میں المجمع العلمی العراقی کے نام سے ۱۹۴۷ء میں شام المجمع علمی السوری کے نام سے ۱۹۲۱ء میں، اسکندریہ میں المجمع العلمی المصری کے نام سے ۱۸۵۹ء میں اسی طرح مجمع اللغۃ العربیۃ کے نام سے قاہرہ میں ۱۹۳۲ء میں دار الترجمے انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کئے گئے،

ان سب سے پہلے محمد علی پاشا کے عہد میں مصر کے اندر ۱۸۲۰ء میں تصر عینی کے نام سے ایک دار الترجمہ قائم ہوچکا تھا، اس میں فرانسیسی اور اطالوی زبانوں سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ اسے مشہور مصنف نبیہ غطاس کے الفاظ میں سنئے،

"چونکہ اصطلاحات اور الفاظ ہی باہمی افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معانی قطعی ہوں، اور عربی دنیا میں ابتک یہ بات پیدا نہ ہوسکی، ادارہ سے متعلق جتنی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں ان میں سے کوئی بھی ہر جگہ مساویانہ طور پہ تسلیم شدہ ہے نہ ہی پورے معنی پہ حاوی ہے، حتی کہ خود ادارہ کا لفظ ابتک قطعی معنی کے لیے خاص نہ ہوسکا، اس کا مفہوم کوئی کچھ لیتا ہے، اور کوئی کچھ، بیسویں صدی کے نصف اول میں

توحید اصطلاحات کی بہت کوشش کی گئی اور ایسے الفاظ جن کے معانی بہت وسیع تھے، انھیں محدود کرنے کی کوشش کی گئی، مثلاً ادارہ، تنظیم، الادارۃ، التنفیذیۃ، سلطۃ، مسئولیۃ وغیرہ، لیکن بہت جلد مفہوم کے تعین میں اختلافات پیدا ہو گئے،

(دیباچہ قاموس الادارہ مکتبۃ لبنان بیروت ۱۹۷۶ء)

اس اقتباس سے عرب ممالک میں عربی زبان کی ترقی کی رفتار اور اس کی سمتوں کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی اس کے پیدا شدہ مسائل پر روشنی پڑتی ہے، زبانوں کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، عربی کے ساتھ بھی یہ واقعہ کئی بار ہو چکا ہے، اوائل اسلام میں یہ لغوی انقلاب بڑے زور و شور سے آیا تھا، چنانچہ مسجد، صوم، صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، اسلام ایمان اور اس طرح تمام وہ الفاظ جن کا تعلق اسلام سے بحیثیت مذہب کے ہے، مثلاً فقہی اصطلاحات وغیرہ ان تمام الفاظ کا استعمال اب لغوی معنی میں نہ ہو کر صرف وہی ہے، جو اسلام نے اصطلاحی طور پر متعین کر دیئے ہیں، مسجد سے غیر اسلامی سجدہ گاہ، صلوٰۃ سے غیر اسلامی عبادت، زکوٰۃ سے غیر اسلامی ٹیکس وغیرہ مراد لینا درست نہیں، اور اگر آپ اجازت دیں تو میں کہونگا کہ لفظ اللہ کی شرح بھی اب صرف وہی ہے، جو اسلام نے متعین کر دی ہے، دوسری زبانوں میں اللہ کے مترادف الفاظ مثلاً GOD یا ایشور وغیرہ کو اللہ کے معنوں میں استعمال کرنے کا میں قائل نہیں، اس کے بعد عہد عباسی میں بغداد کے دار الترجمے میں یونانی اور سنسکرت کی کتابوں کے عربی ترجمے کے وقت اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں چنانچہ ARISTOTLE کے لئے ارسطا طالیس PLATO کیلئے افلاطون RHETORIC کے لئے بطریقہ اور پھر خطابۃ اور پھر بلاغۃ اس طرح ARITHMATIC کے لیے ارثماطیقی اور پھر حساب Geometry کے لیے جیومطریا، اور پھر ہندسہ اس طرح سنسکرت میں کون

پھول کے لئے قرنفل۔ ورشاکال سے ورشغال اور پھر برشغال وغیرہ عربی الفاظ وضع کیے گئے۔ (واضح ہو کہ سنسکرت سے بنائے ہوئے یہ الفاظ عہد جاہلیت میں بھی ملتے ہیں) اور اب بیسویں صدی میں مغربی آثار و تمدن نے ایک بار پھر عربی لغت کو تیزی سے نئے الفاظ وضع کرنے پر مجبور کر دیا ہے، لیکن آج کے طرزِ وضع اور عباسی دور کے طرز میں فرق ہے، اس فرق کو مشہور مصری مترجم اور مصنف استاذ اسماعیل مظہر کی زبان سے سنئے۔

"لیکن یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ ان حضرات نے عربی کے مزاج سے ہم آہنگ الفاظ ترجمے کے لیے تراشے تھے، اس لئے آج مغربی الفاظ و اصطلاحات کے سلسلے میں بھی ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ عربی اصطلاحات بناتے وقت لفظ کے معنی کو اس حد تک قریب کر دیں کہ وہ محدود اور متعین ہو جائے، جیسا کہ ماضی میں ہمارے اسلاف نے فقہ، اصول فقہ، فلسفہ اور ریاضیات وغیرہ کی اصطلاحات متعین کرتے وقت کیا تھا، .... لیکن آج تعریب کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس میں ان امور کی رعایت نہیں کی جا رہی ہے، چنانچہ عامیہ کے الفاظ ادب میں داخل کر لینا، اسی طرح غیر عربی الفاظ کو بجنسہٖ نقل کر لینا عام ہو گیا ہے اس سے احتراز کرنا مناسب ہے،

(مقدمہ کتاب الفرید فی المصطلحات)

یہ پہلا نظریہ ہے، جو زبان کے خالص کرنے پر زور دیتا ہے، لیکن خالص عربی کے ہمدرد سر پٹک کر رہ گئے، ہوا وہی جو ہوتا تھا، کیونکہ مغربی آثار و تمدن نے عربی کے سامنے ایسے ایسے مسائل رکھ دیئے، جو عربی میں پہلے سے تھے ہی نہیں، مثلاً سائنس، ٹکنولوجی، طب و نفسیات وغیرہ کے مسائل و مصطلحات یا یہ کہ عرب تہذیب میں وہ باتیں نہ تھیں، مثلاً یوروپین ممالک سے آئے ہوئے تہذیبی آثار، اور یہ اضافات اس تیزی سے ہوتے چلے گئے کہ سوچنے کا وقت کم

تھا، اس لئے زبان کو عالمی مسائل کے قابل بنانے کے لیے اہلِ قلم عرب کی ایک معتد بہ جماعت اس حق میں ہے کہ یورپین الفاظ بجنسہٖ عربی میں استعمال کر لیے جائیں، یہ دوسرا نظریہ ہے، آپ عربی کا کوئی اخبار اٹھالیں فی صفحہ کم و بیش پچاس لفظ ضرور ایسے مل جائیں گے جو عربی عبارت کی برادری میں مہمان نظر آئیں گے، تکنولوجی، استراتیجی، آٹومیٹک، ہوتل، استاسون، تکنیک، تلغراف، تلفزیون، الکٹرونیک، رادیو، بنک، وغیرہ سامنے کی مثالیں ہیں،

پھر عالم عرب کا ایک سرسری جائزہ حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں،

۱- الفاظ کے معانی میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہوتی جارہی کس لفظ نے اب اپنا قدیم لباس اتار کر نیا لباس پہن لیا ہے، پہچاننا اس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ زبان پر مسلسل نظر نہ ہو۔

مثالیں دیکھئے۔

لفظ	قدیم استعمال	جدید استعمال
اجازہ	اجازت	تعطیل، رخصت، سند وغیرہ
اشارہ	اشارہ	نشان، علامت، ٹرین کا سگنل وغیرہ
اشاری	اشارے والا	سگنل میں Signal man
صحف	آسمانی کتابیں	روزنامہ
تصویت	آواز نکالنا، آواز دینا	بذریعہ آواز ووٹ دینا
اقتراع	قرعہ اندازی	ووٹ بذریعہ طریقہ مروجہ
مدمرہ	تباہ کن	تباہ کن جہاز
غواصہ	غوطہ خور (مونث کیلئے)	آبدوز
تشریح	تشریح کرنا، کھول کھول بیان کرنا	پوسٹ مارٹم

لفظ	قدیم استعمال	جدید استعمال
مشروع	شریعت کی طرف سے لگایا ہوا قانون	پروجیکٹ۔ اسکیم وغیرہ
علم	جانکاری	سائنس
عالم	جانکار	سائنس داں
محفظہ	حفاظت گاہ۔ بستہ وغیرہ	کیپ سول
استاذ	استاذ	پروفیسر (صرف)
ہاتف	غیبی آواز	ٹیلیفون پر بات

میں نے بالکل سامنے کی یہ چند مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ حال یہ ہے کہ آپ خالص ادبی الفاظ کو چھوڑ کر کوئی لفظ ڈکشنری میں دیکھیں اس کے کم از کم ایک درجن معانی اور مواقع استعمال ایسے مل جائیں گے جو زبان میں اضافے کی حیثیت کے ہوں گے، اور اس سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ قدیم معانی اب عموماً متروک ہوتے جارہے ہیں، چنانچہ علم اور عالم کے الفاظ اب سائنس اور سائنس داں کیساساتھ تقریباً مخصوص ہو چکے ہیں، ویسے ہی استاذ اب صرف پروفیسر ہی سمجھا جاتا ہے،

۱- جدید اصطلاحات اور الفاظ ہر جگہ بالکلیہ تسلیم شدہ نہیں ہیں، مثلاً ٹیلیفون سٹ کیلئے ملغاز، INTUITION - کے لیے حدس، گرامفون اور فونوگراف کے لیے محرت، FUSE کے لئے حارزہ، اسٹوڈیو کے لیے محتوف، سیفٹی ریزر کے لیے آلہ الحلاقہ وغیرہ، طب اور سائنس کے مختلف شعبے اور ٹکنولوجی کی مصطلحات اسی ضمن میں آتی ہیں، اس لیے ان کا ضبط بہت مشکل ہے کہ آپ نے جو لفظ جس مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے، اس سے آپ کا

مخاطب بھی وہی سمجھے گا، اب اس مشکل پر قابو پانے کے لیے یعنی ایسی اصطلاحات وضع کرنے کے لیے جو ہر ملک کے لیے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہوں خاص توجہ دی جا رہی ہے، رباط میں مکتبہ التنسیق وترجمہ کا قیام اس کوشش کی عملی شکل ہے،

۲۔ مقامی بول چال میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اس طرح کورٹ، دفاتر، سرکاری نیم سرکاری اداروں کی اصطلاحات بھی ہر ملک میں الگ الگ ہیں، اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ آپ نے جس لفظ کا عراقی استعمال کیا ہے، مصر میں اُس کا دوسرا ہی مفہوم لیا جائے" محکمہ دفاع اور محکمہ قانون یعنی فوج اور عدلیہ کی تمام اصطلاحات اس ضمن میں آتی ہیں، مثال کے طور پر آپ صرف ۳ لفظ مجلس۔ محکمہ اور ادارہ لیں اور مصطلحات کی یا پھر کسی عام عربی انگریزی ڈکشنری میں ان الفاظ کے مواقع استعمال دیکھیں آپ کو مشکلات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا، اور اس طرح کے تغیرات موجودہ صدی میں عربی زبان میں کچھ اس کثرت سے ہوئے ہیں کہ آج کی عربی کا نام ہی جدید عربی رکھ دیا گیا ہے، زبان کے قواعد نہیں بدلے اصول جو تھے، وہ اب بھی ہیں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ اب بھی غیر معیاری ہے، پھر جدیدیت نام کس کا ہے۔ جدیدیت صرف الفاظ ومعانی کے انہی عظیم الشان تغیر وتبدل کا نام ہے۔

اس درمیانی مقدمہ کے بعد آئیے اب پھر واپس ہندوستان چلتے ہیں، یہ مسائل جن کا میں نے ابھی ذکر کیا، ان ممالک کے ہیں جہاں عربی بحیثیت مادری زبان کے بولی اور سمجھی جاتی ہے، بھلا بتائیے ہندوستان جس کے عربی کی درس وتدریس کے مسائل یوں ہی کیا کم ہیں۔ اس مزید اضافے کے بعد یہاں ہمارے طلبہ کا کیا حال ہو گا، ہمارے تمام عربی ادارے اور یونیورسٹیاں اب جدید عربی کی شدت سے ضرورت محسوس کرتی ہیں، اور جدید عربی سے ان کی مراد صرف ابلاغ کی زبان ہوتی ہے، دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ ہم جدید عربی پڑھتے

پڑھاتے ہیں، لیکن ہوتا کیا ہے کہ اول تو ہمارے کم وبیش ۹۰/۰ فیصد طالب علم زبان کی نحوی اور صرفی غلطیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پاتے ان میں وہ غلطیاں بھی شامل ہیں جن کی طرف اس مضمون کے ابتدائی صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے، چنانچہ ہمارے یہاں جو شخص عربی میں بے تکلف باتیں کرتا ہو، وہ ملک کے کامیاب ترین عربی دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ طلبہ تو الگ رہے، ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں پچاس فیصد ایسے نہیں، جو عربی میں بے تکلف باتیں کر سکتے ہوں (بشرطیکہ موضوع صرف درسیاتی نہ ہو) اور جو زبان پر قدرت رکھتے ہیں، ان میں اکثریت ان حضرات کی ہوتی ہے، جو مدرسوں کے توسط سے آتے ہیں، اس لیے ان کا مسئلہ انگریزی ہوتی ہے، بے چارے انگریزی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اور اب جو انگریزی سیکھنی شروع کرتے ہیں، تو آپ ہی بتائیں کہ عمر کے تیسرے دہے میں سیکھی ہوئی زبان پر وہ قدرت کہاں سے حاصل ہو سکتی ہے، جو ابتدائی عمر سے سیکھنے والوں میں ہوتی ہے، اس لیے لاکھ کوشش کے باوجود جناب شیخ کی داڑھی مولوی مدن کی سی نہیں ہونے پاتی۔ وہ حضرات جو محنت اور ذہن کی بدولت دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں ان کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ عرب ممالک سے شائع ہونے والے جرائد ورسائل اور کتابوں کی درآمد اتنی مشکل ہے کہ زبان پر مسلسل نظر رکھنی سخت دشوار ہے، میں نے عرب ممالک میں زبان کی ترقی اور تبدیلیوں کا جو ذکر اوپر کیا ہے، وہ اس تیزی سے ہو رہا ہے، اور اتنا ہمہ جہتی ہے کہ ان تغیرات اور اضافوں سے آگاہی اس وقت تک مشکل ہے، جب تک آپ ہر ملک سے شائع ہونے والے رسائل پابندی سے نہ پڑھتے ہوں، ساتھ ہی مختلف عربی اکیڈمیوں سے شائع ہونے والی، مصطلحات کی میگزینیں آپ کے زیر نظر ہونی بھی ضروری ہیں لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ یہ کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں، اس کا جواب ہم سب ملکر دیں،

تو زیادہ مناسب ہوگا۔

نصاب تعلیم کیا ہونا چاہئے، طریقہ تعلیم میں کیا اصلاح ہونی چاہئے، اچھے عربی داں کس طرح پیدا کئے جاسکتے ہیں، ان تمام باتوں کا جواب دانشور اور ماہرین تعلیم دیں گے، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جب تک طلبہ عربی کو ڈیزائن بنانے والے مضمون کی حیثیت سے پڑھتے رہیں گے، اور ہمارے اساتذہ اس گمراہ کن بلکہ مہلک رجحان کی علاً حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے، ہماری یونیورسیٹیاں صرف فرسٹ ڈویژنرس پیدا کریں گی، اسکالر پیدا کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔

ترسم کہ نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست

بزم تیموریہ حصہ اوّل

بزم تیموریہ کا پہلا اڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین اور مغل شاہزادوں اور شاہزادیوں اور ان کے امراء و فضلاء و شعراء کے تذکرے اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے اڈیشن میں اتنے اضافے ہوئے کہ اس کے تین حصے کرادیے گئے، اس پہلے حصہ میں شروع کے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے تمام قابل الذکر امراء و شعرائے دربار، فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً دربار اکبری کا تو پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔

از:- سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت - ۲۰ روپیے

وفیات

آہ! مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی

از:- ضیاء الدین اصلاحی

"مولانا عبدالرحمن پرواز مرحوم دارالمصنفین آئے اور تقریباً ساڑھے تین سال کے بعد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنی سیرت کی نیکی اور پاکیزگی، اخلاق کی طہارت و شرافت کی جوت جگا کر اچانک دائمی جدائی اختیار کرلی، وہ ہم لوگوں کے درمیان آکر بیٹھتے تو ان کے خوبصورت چہرے سے عیاں ہوتا کہ لوگوں کی دلآزاری اور ایذارسانی کیا بلکہ ان کی دلشکنی کا وسوسہ بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوتا ہوگا، ان کی نورانی داڑھی سے ان کا علم و فضل ظاہر ہوتا رہتا تھا، انھوں نے راہ طریقت کے ایک سچے سالک کی طرح اس دنیا میں باہمہ و بے ہمہ کا مسلک اختیار کرکے پوری زندگی گزاردی انکا بڑا وصف یہ رہا کہ وہ اپنے نفس کو دبا کر بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کو آرام پہنچانے ہی میں اپنی راحت و مسرت محسوس کرتے تھے"

انھوں نے ممبئی کے قیام میں مخدوم علی مہائمی اور مفتی صدر الدین آزردہ کے نام سے دو کتابیں لکھیں، جو علمی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھی گئیں، وہ دارالمصنفین آئے تو انھوں نے خود مفسرین ہند پر ایک کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی، خیال تھا کہ یہ

کتاب تیار ہوگی تو ان کی مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کی طرح علمی حلقے میں شوق سے
پڑھی جائے گی، مگر مصلحت خداوندی سے یہ ادھوری رہ گئی، ان کی اچانک وفات
سے یہاں جو سوگواری اور غمناکی کی فضا پیدا ہوئی ہے، اس سے یہ خاکسار متاثر ہوکر
ان پر خود مضمون لکھنا چاہتا تھا، لیکن مولوی ضیاء الدین اصلاحی ان کے ہم وطن ہیں
اور ایک ہی درسگاہ کے پڑھے ہوئے ہیں، یہاں ان کی زندگی سے بہت قریب تر رہے،
اس لیے خیال ہوا کہ وہی ان پر اچھا تعزیتی مضمون لکھکر ہم لوگوں کے غمناک جذبات کی
صحیح ترجمانی کریں گے۔ اس لئے انکی یہ تحریر میری ہی تحریر تصور کی جائے، مرحوم جا چکے
لیکن وہ یہاں کی مجلسوں میں یاد آئیں گے، اکثر اور بار بار یاد آئیں گے۔ اور دل سے
یہ دعائیں نکلتی رہیں گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت
ان کی روح کو اپنی رحمتوں کے پھولوں اور برکتوں کی خوشبوؤں سے ہمیشہ ہمیشہ معطر
رکھے۔ آمین! "ص، ع"

یہ خبر بہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۳، ۴ دسمبر ۱۹۸۴ء کی درمیانی شب میں
دو بجے مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ
وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے، اور انھوں نے دن بھر کے اپنے سارے معمولات بھی انجام
دئے اس لئے یہ سانحہ بالکل غیر متوقع طور پر پیش آیا جس کی وجہ سے دارالمصنفین کی فضا بہت غمناک ہوگئی
یہ عجیب اتفاق ہے کہ انتقال کے وقت وہ تنہا دارالمصنفین میں موجود تھے، راقم الحروف
اور بعض دوسرے رفقا محترمی جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین
کی معیت میں بہار اردو اکاڈمی کے دعوتنامہ پر اس کے زیر اہتمام ہونے والی علامہ سید سلیمان ندوی

کی صد سالہ تقریباتِ ولادت میں شرکت کے لیے پٹنہ گئے ہوئے تھے، اس لئے ہم سب اپنی غیر
حاضری اور ان کی تجہیز وتدفین میں شرکت سے محروم رہجانے پر سخت ملول، نادم اور دوہرا غم
محسوس کر رہے تھے،

دو برس قبل انھیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی مگر ہومیوپیتھی کے علاج سے افاقہ ہوگیا
تھا، اس کے بعد جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب کے اصرار پر وہ چکپ کے لیے ممبئی تشریف
لے گئے، وہاں سے آنے کے بعد ان کے ساتھ ہم لوگ بھی مطمئن تھے، ۳۰ نومبر کو جب ہم لوگ پٹنہ
کے لیے روانہ ہو رہے تھے، تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ سب کو رخصت کیا، میں نے
کاتب کو دینے کے لیے ایک مضمون ان کے حوالہ کیا، اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا "مجھے ایک
ضرورت سے گھر جانا تھا، مگر دارالمصنفین بالکل خالی ہوجائے گا، اس لئے میرا یہاں سے ہٹنا مناسب
نہیں، اب سب لوگوں کی واپسی کے بعد ہی گھر جاؤں گا"۔ کیا پتہ تھا کہ یہ اُن سے آخری گفتگو ہو رہی ہے
اور اب ہم ان سے اس عالم ناسوت میں ملنے کے بجائے ان کی قبر پر باچشم نم حاضر ہوں گے۔

پٹنہ میں کئی حضرات نے ان کی خیریت دریافت کی، ممبئی سے ان کے دوست جناب شیخ
فرید برہانپوری اور ڈاکٹر خورشید نعمانی تشریف لائے تھے، دونوں نے ان کو بار بار یاد کیا، اور
تاکید سے کہا کہ ان کا سلام ان سے کہدیا جائے، خدابخش خاں لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا
بیدار نے ہم لوگوں کے ذریعہ ایک دعوت نامہ بھی ان کے پاس بھیجا مگر کیا خبر تھی کہ اس نامہ
وپیام کے درمیان موت حائل ہوجائے گی۔

ان کا وطن اعظم گڈھ ضلع کا ایک گاؤں سیدھا سلطان پور ہے، جو یہاں کے مشہور اور
قدیم قصبہ سرائے میر سے تین چار میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے، ان کا شجرۂ نسب محفوظ
ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے

جو سلطان بہلول لودھی کے زمانہ میں افغانستان سے ہندوستان آئے، جونپور کی شرقی سلطنت پر جب بہلول لودھی نے حملہ کیا تو داد شجاعت دینے والوں میں اس خاندان کے سالار خاں پیش پیش تھے، اس کے صلے میں انھیں تیس گاؤں پیش کئے گئے، اسی بنا پر پہلے یہ گاؤں "سی دہ" کہلاتا تھا، جو آگے چلکر سیدھا سلطان پور کے نام سے موسوم ہوا، اس گاؤں کی بڑی آبادی انہی سالار خاں کی نسل سے ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز اسی گاؤں کے ایک متوسط درجہ کے کھاتے پیتے خاندان میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان پیشہ زراعت کے علاوہ علمی و دینی حیثیت سے بھی ممتاز تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا محمد شفیع مرحوم ایک جید عالم اور متورع و متقی بزرگ تھے، جن کی تعلیم دانا پور پٹنہ کے ناریل گھاٹ کے ایک بڑے اہلحدیث مدرسہ میں ہوئی تھی، جہاں انکے چچا حافظ قادر بخش مرحوم ایک مدت سے تعلیمی خدمات پر مامور تھے، مولانا محمد شفیع صاحب نے یہاں مولانا سخاوت علی جونپوری کے تلمیذ رشید مولانا فیض اللہ مئوی سے درس لیا جو علامہ شبلی نعمانی کے بھی استاذ تھے، اس کے بعد دہلی جاکر میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے،

مولانا محمد شفیع صاحب درسیات کی تکمیل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو انھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور شرک و بدعات کے انسداد کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کی داغ بیل ڈالی جس کے کاموں کا دائرہ آگے چلکر بہت وسیع ہوگیا، چنانچہ اسی سلسلہ میں انھوں نے علم دین کی اشاعت و فروغ کے لئے مدرستہ الاصلاح قائم کیا، اور مدۃ العمر اس کی خدمت کرتے رہے، انہی کی درخواست پر علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی نے بھی اس مدرسہ کی جانب توجہ کی اور مولانا فراہی کی بدولت اس مدرسہ نے بڑی ترقی کی، اور

اس سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا، اور اب بھی پہنچ رہا ہے۔

مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادے تھے، سب سے چھوٹے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے، مولانا عبدالرحمٰن پرواز ان سے بڑے، اور باقی تین بھائیوں سے چھوٹے تھے، بڑے چاروں بیٹوں کی تعلیم مدرستہ الاصلاح میں ہوئی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز ۱۹۴۰ء میں مدرسہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد وہ درس و تدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، ۱۹۴۶ء میں مشہور شاعر جناب احسان دانش مرحوم کی دعوت پر وہ لاہور چلے گئے، مگر ایک برس بھی یہاں نہیں گذرے تھے کہ تقسیم کی خبر سن کر وطن واپس آگئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، یہاں سے "الہدیٰ" کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹروں میں ان کا نام بھی تھا، وہ ۱۹۵۵ء میں بمبئی آگئے اور انجمن اسلام کے مختلف اسکولوں میں عربی کے استاد ہوئے، آخر میں احمد سیلر ہائی اسکول ڈمٹکر روڈ سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوکر دارالمصنفین آئے۔

وہ بمبئی کے قیام کے زمانہ میں مختلف اردو اخباروں سے بھی وابستہ رہے، روزنامہ "ہندوستان"، "انقلاب"، "اردو ٹائمز" اور "انقلاب" وغیرہ میں عرصہ تک مذہبی، علمی اور تاریخی کالم لکھتے رہے، گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر سے بھی ان کا تعلق رہا، میں ایک دفعہ ان سے ملنے کے لیے یہاں گیا تو بہت خوش ہوئے اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور حامد اللہ ندوی وغیرہ سے ملایا۔

اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ پر ان کی اچھی نظر تھی، ان کے والد اپنے تمام بچوں کو ادبی کتابوں کے مطالعہ کی تلقین کرتے تھے، پرواز صاحب نے ان کی ترغیب سے غالب کے خطوط اور سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور مولانا شبلی کی اکثر تصانیف کا مطالعہ کیا اور مسدس حالی

سبقاً سبقاً ان سے پڑھی، کہتے تھے کہ اس کے تقریباً نصف اشعار مجھے زبانی یاد ہو گئے تھے ان کی فارسی کی استعداد بھی اچھی تھی، میں اس کی مشکلات میں جب ان سے رجوع کرتا تو وہ تشفی کر دیتے، اس کا ذوق بھی انکے والد صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا،

وہ مدۃ العمر درس و تدریس کے مشغلہ سے وابستہ رہے، مگر تحریر و تصنیف کی جانب ہمیشہ انکا رجحان رہا، مضمون نگاری کا شوق بچپن سے تھا، اور طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے تھے، مختلف وقتوں میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱- مزدور اور اسلام (۲) مومنؔ، حیات و شاعری، (۳) علم و ہدایت کے چراغ (۴) نظام حق کے معمار (۵) حضرت مخدوم علی مہائمی، حیات آثار و افکار (۶) مفتی صدرالدین آزردہ، بمبئی کے قیام کے زمانہ میں انھیں پڑھنے لکھنے کا زیادہ موقع ملا، موخر الذکر دونوں کتابیں یہیں لکھی گئیں، اور یہ ان کی تلاش و تحقیق اور محنت و کاوش کا نتیجہ ہیں، ان میں سے ایک میں کوکن کے مشہور اور بڑے صوفی و عالم حضرت مخدوم علی مہائمی کے حالات و واقعات زندگی کے علاوہ شروع میں ان کے وطن ماہم اور خاندان نوایط کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور انکے علمی کمالات تصنیفات اور افکار و نظریات پر مبسوط بحث و گفتگو کی گئی ہے، اور تفسیر، فلسفہ اور تصوف میں ان کا امتیاز دکھایا گیا ہے، مخدوم صاحب کے صوفیانہ افکار کی وضاحت کے ضمن میں نظریہ وحدت الوجود پر مفید اور اچھی بحث کی ہے، یہ موضوع بڑا نازک ہے مگر مصنف اس مرحلہ سے اعتدال و سلامت روی کے ساتھ گذرے ہیں، اور اس کی اچھی وضاحت بھی کی ہے، اس کتاب کی وجہ سے وہ بمبئی میں پورے طور پر متعارف و مقبول ہو گئے تھے، اور علمی حلقوں میں بھی ان کا وزن محسوس کیا جانے لگا تھا۔

دوسری کتاب بھی علمی و تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک اضافہ ہے، اس میں مغلیہ سلطنت کے دور زوال کے نامور فاضل مفتی صدرالدین آزردہ کے بارہ میں، پہلی مرتبہ اس قدر محنت و کاوش سے مواد و معلومات جمع کئے گئے ہیں جس سے ان کے خاندانی و ذاتی حالات تفصیل سے معلوم ہو جاتے ہیں، اس میں ان کے فضل و کمال وغیرہ کے متعلق ان کے معاصرین کی شہادتیں بھی نقل کی گئی ہیں، اور ان کی قومی و مذہبی خدمات بھی بیان کی گئی ہیں، اور مصنف نے انکی فارسی و عربی تحریروں اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے بھی دئے ہیں، اور ان کی تصنیفات کا تعارف دیدہ ریزی سے کرایا ہے،

مولانا عبدالرحمٰن پرواز نے مداحِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کے حالات اور شاعری پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جس کے بعض اجزا ماہنامہ برہان میں عرصہ ہوا چھپے تھے، مگر یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی، دو اور کتابیں بھی زیر ترتیب تھیں، ایک حضرت امیر خسروؒ پر، اور دوسری حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی پر ہے۔

دار المصنفین میں انھوں نے ہندوستانی مفسرین کے موضوع پر کام شروع کیا تھا جس کے لیے وہ اپنا مطالعہ مکمل بھی کر چکے تھے، اور وہ اس کا تقریباً نصف حصہ مرتب بھی کر چکے تھے، اگر ان کی عمر وفا کرتی تو غالباً چند ماہ میں اسے مکمل کر لیتے۔

شعر و سخن کا ذوق خاندانی تھا، ان کے والد بزرگوار کو بھی عنفوان شباب میں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، اور وہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی تو موجودہ معیار کے بلند پایہ شاعر خیال کئے جاتے ہیں، پرواز صاحب نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی، بچپن ہی میں مشق سخن کرنے لگے تھے، اور ان کا کلام بھی اخباروں اور رسالوں میں چھپتا تھا، نجی محفلوں میں اشعار سناتے بھی تھے، مگر مشاعروں میں پڑھنے کے عادی نہ تھے،

البتہ کبھی کبھی مشاعروں کی صدارت کرتے تھے، اُن کی نظمیں اور غزلیں نہایت پاکیزہ ہوتی تھیں، اور ان میں اسلامی احساسات وجذبات کی ترجمانی ہوتی تھی، مگر اب شعروشاعری سے زیادہ رغبت نہیں رہ گئی تھی، تاہم ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، جو طبع نہیں ہوسکا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ان کو بڑا تعلق واخلاص تھا، یہ ان کے والد مرحوم کی یادگار بھی ہے، اور ان کی از اول تا آخر یہیں تعلیم بھی ہوئی تھی، اس لئے، وہ اس کی ہر خدمت کیلئے مستعد اور سرگرم رہتے تھے، اور اس کی ترقی کے لیے برابر فکرمند بھی رہتے تھے، کئی برس سے وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی ہوگئے تھے، اور پابندی سے مجلس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھو، اور اس کی کارروائی اور مدرسہ کی تعمیر وترقی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے تھے، انکی دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کی نظامت بھی پیش کی گئی مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا، بمبئی میں مدرسہ کی ایک موقوفہ جائداد میں اس کے متولی عرصہ سے بیجا تصرف اور ناجائز خردبرد کررہے تھے، بالآخر پرواز صاحب نے اس مسئلہ میں پوری دلچسپی لی اور منشی عبدالعزیز انصاری صاحب، مولانا مستقیم احسن اعظمی اور دوسرے خیرخواہانِ مدرسہ کے تعاون سے اسے ان کے تصرف سے نکالنے میں غیرمعمولی جدوجہد کی، حال میں مجلس انتظامیہ کے ارکان نے قرآن مجید کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور مدرسہ سے ان کی غیرمعمولی دلچسپی کی بنا پر انھیں اجلاس کا ناظم مقرر کیا تھا، انھوں نے اس کے لئے ابتدائی تگ ودو بھی شروع کردی تھی کہ خود ان کا وقت آخر آگیا۔

ملی، قومی اور سیاسی سرگرمیوں سے انھیں نہ زیادہ دلچسپی تھی اور نہ وہ ان میں کوئی عملی حصہ لیتے تھے، تاہم مفید اور نیک کاموں میں تعاون سے دریغ بھی نہ کرتے تھے، ان کے گاؤں میں عیدگاہ کی تعمیر کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا، حال میں شہر کے

بعض لوگوں نے ایک مسلم ہاسپٹل کی اسکیم بنائی ہے، وہ اسے قوم وملت کی ایک بڑی اور اہم ضرورت خیال کرتے تھے، اس لئے مسلم ہاسپٹل کے کارکنوں سے برابر رابطہ رکھتے اور انھیں مفید مشورے بھی دیتے،

ان کے والد بزرگوار اپنے دور کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی (متوفی ۱۳۱۱ھ) سے پہلے بیعت ہوئے اُن کے انتقال کے بعد یادگار سلف حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۹ھ) کی جانب رجوع کیا اور حضرت سید صاحب سے خلافت واجازت بھی حاصل کی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی، چند برس قبل وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملنے رائے بریلی گئے تو اپنے والد کے مرشد کے وطن اور مسکن کی زیارت کے لیے نصیر آباد بھی تشریف لے گئے۔ ان کو تصوف سے محض نظریاتی دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ اس راہ کے سالک بھی تھے، آٹھ، دس برس قبل وہ اس دور کے نامور شیخ طریقت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ ان سے بیعت ہوئے، اس کے متعلق جب میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اصلاح باطن، تزکیۂ نفس اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ ان میں تقشف، اور گروہی عصبیت نہ تھی، طبیعت میں بڑا اعتدال اور توسع تھا، ہر طبقہ کے لوگوں سے انکے تعلقات تھے،

وہ طبعاً خاموش، سنجیدہ، حلیم، بردبار، بے ضرر اور مرنجاں مرنج شخص تھے، نہ کسی کی ٹوہ میں رہتے اور نہ کسی کی غیبت وتنقیص کرتے، مردم آزاری اور ایذارسانی کا ان میں کوئی مادہ ہی نہ تھا، طبیعت میں نرمی، مروت، ملاطفت اور شرافت تھی، کسی کے ذریعے سے تکلیف اور اس کے طرزعمل سے شکایت بھی ہوتی تو ضبط وتحمل سے کام لیتے، اور غصہ وبرہمی کا اظہار نہ کرتے، ان میں تواضع وخاکساری تھی، ان کی کسی ادا سے رعونت وبرتری کا

پتہ نہ چلتا تھا، انھیں خود نمائی اور خودستائی کی مطلق عادت نہ تھی، کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے علو و پندار ظاہر ہوتا، نام و نمود، نمائش، ظاہر داری اور بناوٹ سے نفرت تھی، خود غرضی، ریا، منافقت اور رشک و حسد سے ان کا دل پاک و صاف تھا، انکی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے بری تھی، بڑے قناعت پسند تھے جو کچھ میسر ہوتا اسی کو کافی سمجھتے اور اسی میں ہنسی خوشی گذر بسر کر لیتے، نہ کسی چیز کی ہوس ہوتی اور نہ کسی اعزاز و اکرام کی طلب، اس معاملہ میں ان کا مزاج بالکل صوفیانہ اور درویشانہ تھا، طبیعت میں غیرت و خودداری تھی، اس لئے دوسروں سے کوئی کام لینا اور کسی چیز کو طلب کرنا گوارا نہ تھا، اپنا ضروری کام بھی خود ہی کر لیتے تھے، خود تکلیف اٹھاتے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی فکر رہتی، اللہ تعالےٰ نے انھیں کوئی اولاد نہ دی تھی، مگر اپنے عزیزوں اور متعلقین کی خبر گیری سے غافل نہ رہتے، اپنے ایک عزیز کی بچی کی پرورش کی، جو کچھ کمایا اس پر اور اس کے بال بچوں پر صرف کر دیا اور اپنے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھا۔

نہایت وجیہ و شکیل، شایستہ اور باوقار شخص تھے، چہرہ بڑا پُر نور تھا، اس سے متانت، سنجیدگی، طہارت، پاکیزگی اور معصومیت بھی ظاہر ہوتی تھی، سادہ لوحی اور معصومیت کی بنا پر بعض معاملات کی گہرائی تک انکی نظر نہ جاتی، اور خود غرض قسم کے لوگ ان سے اپنا مطلب حاصل کر لیتے۔ کسی قدر جذباتی بھی تھے، اور چونکہ لاگ لپیٹ اور رو رعایت کے عادی نہ تھے، اس لئے وقتی طور پر طبیعت میں اشتعال بھی پیدا ہو جاتا مگر نہ اس کا اثر دیرپا ہوتا، اور نہ کسی سے کینہ و کدورت رکھتے۔

اپنی نیکی، شرافت اور اخلاق و سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر جہاں بھی رہے مقبول اور ہر دلعزیز رہے، نہ کسی کو ان سے اور نہ ان کو کسی سے کوئی شکایت ہوئی، خداوندا اپنے اس نیک اور مقبول بندے کی مغفرت فرما اور اسے اعلیٰ علیین میں جگہ دے! آمین۔

مولانا عبدالرحمن پرواز کے مخلص دوست حکیم عبدالباقی نامی اعظمی کو ان کے انتقال پر بڑا ملال ہوا، اور انھوں نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ وفات کہا۔

صد حیف جو پرواز اپنا بے تکلف دوست تھا — اب چھوڑ کر یہ عالم رنج و محن جاتا رہا
جس سے قائم شام کا تھا لطفِ صحبت آہ وہ — اک ہمدم دیرینہ و رشیم زدن جاتا رہا
برپا نہ کیوں ہو حشرِ غم اب انجمن در انجمن — ہیہات جو تھا رونقِ صدرِ انجمن جاتا رہا
اب بزم علم و فن نظر آئے نہ کیوں بے نور سی — جس سے روشن تھا چراغِ علم و فن جاتا رہا

بیتاب نامیؔ نے کہا یوں مصرعِ سالِ وفات
اَب عالمِ دیں رونقِ افزائے سخن جاتا رہا
۴ ۸ ۱۹ ۶

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ محمدی

از ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تاریخ محمدی مصنفہ میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خاں بن قباد مخاطب بہ دیانت خاں حارثی بدخشی دہلوی ایک اہم تاریخی دائرۃ المعارف ہے۔ اس میں ہجری سال کے شروع سے ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء تک کے چند ہزار اہم اشخاص کی وفات اور بعض تاریخی امور کا اجمالی ذکر ہے۔ یہی سال غالباً مصنف کی وفات کا سال ہے۔

اس تاریخی دستاویز کی جلد دوم کا چھٹا حصہ ہندوستان کے معروف عالم و محقق امتیاز علی عرشی صاحب مرحوم نے تصحیح و تحشیہ کے بعد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے شائع کیا ہے۔ اس حصے میں مصنف نے اپنے معاصر یعنی بارہویں صدی ہجری کے مختلف اہل علم، وزراء، امراء اور ان کے متعلقین کی وفیات کا سال بسال ذکر کیا ہے۔ عرشی صاحب مرحوم نے ایک سو چوالیس ۱۴۴ صفحات کے اس متن پر ستاشی صفحے کے حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ ان حواشی کی ترتیب میں چورانوے ۹۴ اہم منابع سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اشاعت رضا لائبریری رامپور کے اس نسخے پر مبنی ہے جو بقول مرتب خود مؤلف کا کتابت کردہ ہے۔

یہ کتاب جہاں مصنف کی دقت نظری اور اعلیٰ علمی کوشش کی مظہر ہے وہاں مرتب کے تجر علمی، وسیع معلومات اور محققانہ جد و جہد کا بین ثبوت بھی ہے۔ تاریخ محمدی کا وہ خطی نسخہ جو مرتب کے پیش نظر تھا ایک لحاظ سے ناقص ہے۔ اس میں چند جملے نسخے کی کرم خوردگی کی بنا پر

پڑھے نہیں جا سکے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے مرتب نے دوسرے دستیاب منابع سے مدد لی ہے۔ اس کے باوجود ابھی بعض مقامات پر الفاظ و عبارات پڑھی نہیں جا سکیں۔

راقم حروف نے حال ہی میں سیر المنازل کا فارسی متن مرتب کیا ہے۔ اس میں دہلی کی مختصر تاریخ، جغرافیہ اور یہاں کی تاریخی عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے سنگین بیگ نے انیسویں صدی عیسوی میں تالیف کیا تھا۔ سیر المنازل کا یہ متن اور اس کا اردو ترجمہ ایک ہی جلد میں ایوان غالب نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ سیر المنازل کے حواشی کی ترتیب میں تاریخ محمدی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مقام پر خود مطبوعہ تاریخ محمدی میں ایک مفقود نام کی نشاندہی بھی سیر المنازل کی مدد سے ہو گئی۔ یہ نام عرشی صاحب مرحوم کے پیش نظر خطی نسخے میں کرم خوردگی کی وجہ سے موجود نہیں۔ ان سطور میں اسی کی طرف اشارہ منظور ہے۔

مطبوعہ تاریخ محمدی کے صفحہ ۱۳۰ پر درج ذیل عبارت مرقوم ہے:

"...... بنت حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں، زوجۂ معز الدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ و والدۂ پسرانش حیدر قلی خاں و جعفر قلی خاں، اوائل عشرۂ ثالثۂ صفر در شاہجہان آباد فوت شد"

اس عبارت میں حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں کی لڑکی اور معز الدولہ حیدر قلی خاں کی زوجہ کی تاریخ وفات دی گئی ہے لیکن اس خاتون کا نام موجود نہیں جس کی تاریخ وفات درج کرنا مؤلف کا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ محمدی کے درج بالا اقتباس میں حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں، معز الدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ، حیدر قلی خاں اور جعفر قلی خاں کے نام ملتے ہیں۔

حسن بیگ مخاطب بصف شکن خاں فرخ شاہ کے میر آتش تھے۔ یہ فرخ سیر اور جہاں دار شاہ کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران ۱۳، ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۲/۱۷۱۲ء میں مارے گئے۔[۱]

"معز الدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ" یہ خطاب آقا محمد رضا اسفرائینی کو دیا گیا تھا، جو محمد شاہ کے میر آتش تھے۔ یہ نہایت سخت گیر انسان تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ خس خانے میں سوتے ہوئے کسی وجہ سے آگ سے جل گئے اور کچھ مدت بعد پچاس سال سے زیادہ زندہ رہ کر شب جمعہ ۱۴ رمضان، ۱۱۴۷/ ۱۷۳۴ء کو شاہجہان آباد میں فوت ہوئے۔[۲] چاندنی چوک دہلی میں مسجد فتح پوری کے نزدیک حویلی حیدر قلی آج بھی ایک محلے کا نام ہے۔ غالباً یہاں واقع حویلی انھی حیدر قلی کے نام سے موسوم رہی ہو گی۔

خود تاریخ محمدی میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کی وفات کا ذکر موجود ہے۔ ان کا ایک لڑکا محمد عسکری، محمد شاہی امرا میں شامل تھا اور ۱۱۵۰ھ - ۱۷۳۷ء کے اواخر محرم میں شاہجہان آباد میں فوت ہوا۔[۳] ان کا دوسرا لڑکا محمد کاظم تھا۔ یہ بھی اپنے زمانے کا ایک امیر تھا اور فتح علی خاں بن ثابت خاں کے خلاف جنگ میں ۴، رجب ۱۱۵۱ھ - ۱۷۳۸ء میں مارا گیا۔ بہر حال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان دونوں میں بڑا کون تھا۔ تاریخ محمدی کے درج بالا فارسی اقتباس میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کے نام تحریر ہیں۔ ایک حیدر قلی خاں اور دوسرا جعفر قلی خاں۔ گمان غالب یہ ہے کہ تاریخ محمدی میں ایک دوسرے مقام پر مذکور (جہاں معز الدولہ کے دو لڑکوں کی وفات کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے اور درج بالا سطور میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے) معز الدولہ کے دو لڑکوں محمد عسکری اور محمد کاظم کو حیدر قلی خاں اور جعفر قلی خاں

۱؎ تاریخ محمدی، ص ۳۱ ۲؎ تاریخ محمدی، ص ۶۲، منتخب اللباب، ج ۲، ص ۹۷۳، ۳؎ مآثر الامرا، ج ۳ ص ۷۶۶-۷۵۱۔ یہاں ان سے متعلق تفصیلی حالات تحریر ہیں، سیر المتاخرین، ج ۲، ص ۴۵۹

کے خطابات سے نوازا گیا ہو گا۔

دہلی میں علاقہ سوتیاں کھان کے عقب میں ایک بستی "حبش پورہ" ہے۔ اس آبادی میں ایک مسجد واقع ہے۔ اس میں درج ذیل کتبہ کندہ تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

"در عہد محمد شاہ ۱۱۴۴ ہجری برای ثواب بخشیدن نواب معز الدولہ بہادر و بی بی ارجمند خانم و نواب کاظم خاں مرحوم۔ ہر کس کہ نماز بخواند، ثواب باین سہ ارواح بخشد و ہر کہ خدمت اینجا را قبول کند، شرط این است: چیزیکہ در سالی از اینجا پیدا شود، اول عرس نواب معز الدولہ بکند، چہار دہم رمضان المبارک و عرس بی بی ارجمند خانم بکند، ہفتم ماہ صفر و عرس نواب کاظم خاں مرحوم، ہفتم ماہ رجب۔ اگر برین شرط قبول کند و در خدمت عمل نکند، برو طلاق است و ہر روز چراغ ناغہ نشود و ہر شب جمعہ شیرینی گلہای فاتحہ کند و مالک این مسجد و چاہ میرزا مہدی علی خاں بہادر ولد نواب کاظم خاں بہادر بن معز الدولہ بہادر، بی بی دیانت نسا خانم والدۂ میرزا مہدی علی خاں، خرچ اخراجات ہمہ در قبض و تصرف او شان است"۔[۱]

تاریخ محمدی سے درج بالا اقتباس اور اس سے متعلق ضروری تشریحات کے پیش نظر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سیر المنازل میں منقول اس کتبے کا تعلق آقا محمد رضا اسفرائینی مخاطب بہ معز الدولہ حیدر قلی خاں بہادر ظفر جنگ سے ہے۔ دیگر قابل توجہ امر یہ ہے کہ معز الدولہ کی زوجہ کا نام بی بی ارجمند خانم تھا۔ جو تاریخ محمدی کے مطابق ۱۱۵۰ ہجری میں صفر کے اوائل عشرۂ ثالثہ میں فوت ہوئیں۔ فارسی کتبے کے مطابق، ان کی قطعی تاریخ وفات ۷، صفر ہے۔ بہر حال مطبوعہ تاریخ محمدی میں معز الدولہ کی زوجہ کا نام کرم خوردگی کی نذر ہو گیا ہے جو اس کتبے کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی کتبے سے محمد کاظم خاں کی زوجہ بی بی دیانت نسا خانم اور ان کے ایک لڑکے میرزا مہدی علی خاں کے نام کا علم بھی ہوتا ہے۔

۱؎ سیر المنازل، سنگین بیگ، مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ایوان غالب ۱۹۸۲ء، ص ۵۲

ادبیات

غزل

از پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ صدر شعبہ اردو جموں یونیورسٹی

بدن کی خاک میں دل اس طرح پُرنور رہتا ہے . شرارہ جیسے قلبِ سنگ میں مستور رہتا ہے

عجب جلوہ ہے جو ہو کر قریب شہ رگ جاں بھی . نگاہوں کی رسائی سے بہت ہی دور رہتا ہے

خوشا وہ دل جو مالا مال ہے فرقت کی دولت سے . وہی دل وصل کے عالم میں بھی مہجور رہتا ہے

تصور میں نہ آئے گا وہ جب تک کیسے جانوں گا . مرے نزدیک رہتا ہے کہ مجھ سے دور رہتا ہے

اب اس سے کیا زیادہ مرتبہ درکار ہے اے دل! . کہ تو اُن کے حضور آ کر بھی نامنظور رہتا ہے

صدف جب دے دیا ہے آنکھ کا پھر اور کیا مانگوں . ہمیشہ موتیوں سے یہ صدف بھرپور رہتا ہے

درونِ دل جہاں ظلمات کی دولت عطا کر دی . وہیں ظلمات میں روشن چراغ طور رہتا ہے

دیارِ حسن میں اے دل! وفا کی جستجو کیسی . کہ یہ وہ ملک ہے جس کا یہی دستور رہتا ہے

خدا نے علم سے آزادؔ کو نا آشنا رکھا . عجب انساں ہے لیکن جہل پہ مغرور رہتا ہے

غزل

از ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفرؔ، رئیس ہائی اسکول، بھیونڈی، بمبئی

ہر رنج ہر الم کے طلب گار ہم ہوئے : ہم جیسے جنسِ غم کے خریدار کم ہوئے

مشفق ہوئے، شفیق ہوئے، محترم ہوئے . حیرت ہے پھر بھی لطف کے قابل نہ ہم ہوئے

ہوں کس سے داد خواہ کہ ہم پر تو آج تک . جو بھی ستم ہوئے وہ بنام کرم ہوئے

اے حسن! زندہ باد کہ رسوا نہ تو ہوا . بدنام بھی ہوئے تو زمانے میں ہم ہوئے

گروی رکھی زبان، نہ بیچے دماغ و دل . تب جا کے لوگ صاحبِ لوح و قلم ہوئے

سر سے کفن جو باندھ کے میداں میں آ گئے . سر ہی کٹے، نہ ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

پھر اعتبار اہلِ سیاست کا کر لیا

لو پھر شکار وعدۂ فردا کے ہم ہوئے

غزل

از جناب وارثؔ ریاضی صاحب ایم اے ہنر بی چمپارن

آپ نے عزت کبھی بخشی کبھی رسوا کیا . شکریہ میرے لیے جو کچھ کیا اچھا کیا

عقل وہام مکر و حیلہ میں اُلجھ کر رہ گئی . عشق نے دشواری منزل کو سر تنہا کیا

اُن کی زلفوں سے بھی وہ پُر پیچ تر ہوتا گیا . جیسے جیسے گیسوئے قسمت کو سلجھایا کیا

میری بدنامی کا چرچا ہر طرف ہونے لگا . اس دلِ خود غرض نے جیسا کہا ویسا کیا

وادیٔ غربت میں میرا ہم سفر کوئی نہ تھا . اپنی بربادی کا منظر آپ ہی دیکھا کیا

وہ جفا کرتے رہے، پھر بھی رہے دل کے قریب . میں وفاؤں پر نگاہِ لطف کو ترسا کیا

ترکِ الفت پر وہ احساس پشیمانی کے بعد . مجھ کو سمجھایا کیے، میں ان کو سمجھایا کیا

امتحاں گاہِ محبت میں مجھے اللہ نے . "دردِ دل" دے کر برائے امتحاں پیدا کیا

اس کی عقل و آگہی پر ہے بہت حیرت مجھے . جو خدا کی خلق کو حاجت روا سمجھا کیا

میں نے ہی کھایا ہے ہر دم آشنائی کا فریب

اُس نے تو وارثؔ مجھے نا آشنا سمجھا کیا

———:———

مطبوعات جدیدہ

الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند مرتبہ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۷۰، قیمت ۲۰ ل، س، پتہ:- مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق، شام

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد خصوصاً مسلمانوں کی علمی تاریخ پر بڑی وسیع اور عمیق تھی، انہوں نے اس موضوع پر تنہا اتنا کام کیا ہے، جس کو دوسرے ملکوں میں اکیڈمیاں اور متعدد اشخاص مل کر انجام دیتے ہیں، ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی دور کے شعراء، مشائخ اور سلاطین و امراء کے متعدد تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں ہیں، لیکن یہاں کے علماء و فضلاء کے تذکرے اور ان کے کارناموں پر مستقل کتابیں کم لکھی گئی ہیں، مولانا نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے نزہۃ الخواطر کی آٹھ جلدوں میں علمائے ہند کے تراجم لکھے، اور اس کے مقدمہ کے طور پر یہ کتاب لکھی جو ہندوستانی علماء و مصنفین کی مختلف النوع تصانیف کی ایک جامع فہرست ہے، انہوں نے اس میں صرف کتابوں کے نام درج کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ہر علم کی تعریف اور اسکی مختصر تاریخ بھی تحریر کی ہے، اور دنیائے اسلام میں اس موضوع پر جو مستند و معروف کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلے ان کا ذکر کیا ہے، اور آخر میں ہندوستانی علماء کی عربی، فارسی اور اردو تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، شروع میں ہندوستان کے قدیم نصاب درس کا خاکہ اور اس میں ہونے والی عہد بہ عہد ترقی و تبدیلی کا ذکر بھی ہے۔ اس اعتبار سے اس کی وہی حیثیت ہے جو ابن الندیم کی الفہرست، طاش کبریٰ زادہ کی مفتاح السعادۃ اور ملا کاتب چلپی کی کشف الظنون

کی ہے، اور اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی، تعلیمی اور ذہنی و فکری تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں المجمع العلمی العربی دمشق سے شایع ہوئی تھی، جسکا نام تبدیل ہوکر اب مجمع اللغۃ العربیۃ ہوگیا ہے، ۱۹۶۹ء میں دارالمصنفین سے اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے بھی چھپ چکا ہے، اب اس کا دوسرا عربی ایڈیشن بھی دمشق ہی سے شایع ہوا ہے، جس کے آخر میں مصنف مرحوم کے لائق و فاضل فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولوی شمس تبریز خاں صاحب کے تعاون سے ایک ضمیمہ کا اضافہ بھی کیا ہے، جس میں ہر فن کی ان کتابوں کا ذکر ہے، جو مصنف کے بعد مرتب کی گئی ہیں، اس سے یہ کتاب "اپ ٹو ڈیٹ" ہوگئی ہے، اور اس کا فائدہ بھی بڑھ گیا ہے،

صاعقۂ طور مرتبہ جناب تاج پیامی صاحب، لکچرر شعبۂ جغرافیہ ایچ۔ ڈی، جین کالج آرہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۳۲، مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت ۵۴ روپیے، ناشر:- اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ۳،

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو کے مشہور اور بڑے نقاد بلکہ بہار میں فن تنقید نگاری کے امام سمجھے جاتے تھے، مگر ان کی زندگی ہی میں ان پر سخت تنقیدیں ہونے لگی تھیں، یہاں تک کہ خود بہار کے بعض ادیبوں و نقادوں نے انہیں ہر اعتبار سے تہی مایہ اور فن تنقید سے نابلد قرار دینا شروع کیا، اور انہوں نے ان کی تحریروں میں زبان و بیان کے اغلاط بھی دکھائے، اکتوبر ۸۳ء میں ماہنامہ سہیل گیا نے ان کے متعلق ایک خصوصی شمارہ شایع کیا، جس میں بہار کے ایک برگزیدہ و باوقار اہل قلم پروفیسر سید محمد محسن سابق صدر شعبۂ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی کے کئی مضامین شایع ہوئے ہیں، جن میں ان کی ادبی و تنقیدی خامیوں، زبان و بیان کے اغلاط یہاں تک کہ اخلاقی کمزوریوں

کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، جناب تاج پیامی کی زیر نظر کتاب میں بھی کلیم الدین صاحب کے تنقیدی نظریات کو مضحکہ خیز اور باطل قرار دیا گیا ہے، یہ کتاب ان کی زندگی ہی میں شایع ہو گئی تھی، مگر اس پر تبصرہ کی گنجایش اب نکلی، یہ تیرہ مضامین پر مشتمل ہے، اور ہر مضمون میں کلیم الدین احمد کے انتہا پسندانہ تنقیدی نظریات اور اردو شعراء، اردو شاعری خصوصاً غزل کے بارے میں ان کے الزامات کا تجزیہ کر کے کلیم صاحب کی غلطی، بے راہ روی اور غیر ذمہ داری ثابت کی گئی ہے، پہلے مضمون کی حیثیت مقدمہ کی ہے، اس میں ان کی تنقید کو یکسر تخریبی ثابت کیا گیا ہے، اس کے بعد کے مضامین میں ان کے مندرجۂ ذیل اعتراضات پر بحث و گفتگو کر کے ان کی مدلل تردید کی گئی ہے، [1] اردو شاعری فارسی کی کورانہ تقلید ہے، [2] ہر لفظ، ہر بندش، ہر محاورہ اور ہر صنعت کیلئے سند کی تلاش، اردو کی ترقی اور اس میں جدت طرازی کے لیے سد راہ بنی، [3] انسان کو ماحول کا پروردہ سمجھنا محض اختراع ہے، [4] ادب و معاشرہ میں تعلق نہیں، غزل پر بحث کے لیے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، روایتی، لسانی وغیرہ پس منظر کو زیر بحث لانا غیر متعلق بات ہے، [5] اردو شاعری محض قافیہ پیمائی کے مترادف ہے، [6] اردو شعراء شاعرانہ خوبیوں سے نابلد ہیں، [7] میر، سودا، درد، مومن، ذوق اور غالب اگر نظمیں لکھتے تو بڑے شعراء ہو سکتے تھے، [8] مسدس حالی شعریت اور اچھی نثر سے خالی ہے، [9] اکبر کا نظمیں نہ لکھنا اور اپنا وقت مفرد اشعار اور دو شعروں کے قطعوں پر برباد کرنا اور جوش کا الفاظ کا کھوکھلا ڈھول زور شور سے بجانا، [10] اردو شعراء کی کردار کشی یعنی [11] کلیم الدین کا ان پر عشق سادہ رویاں، ہوس پرستی، اوباشی اور رندی و میخواری کا الزام، اردو غزل میں کوئی خاص مسلسل مضمون نہ بیان کرنا، [12] غزل کو غیر مہذب، نیم وحشی اور مبتذل ترین صنف قرار دینا، اور اس میں ربط، ارتقائے خیال اور مکمل تجربہ کا نہ ہونا، مصنف کے نزدیک کلیم الدین صاحب کے الزامات کا بنیادی اور اصلی سبب ان کی مغرب سے مرعوبیت ہے،

اس لیے جواب کی تائید کے لیے انگریزی ادیبوں کے حوالے اکثر دیئے گیے ہیں، کلیم الدین مرحوم چونکہ انگریزی ادب و شاعری کو اصلی معیار سمجھتے تھے، اور اسی کسوٹی پر اردو شاعری کو بھی پرکھتے تھے، اس لیے مصنف نے خود انگریزی شاعری میں بھی اسی قسم کے جھول اور نقص دکھلائے ہیں، جو کلیم الدین صاحب کو اردو شاعری میں نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے اردو شاعری کو انگریزی شاعری کے مقابلہ میں فائق اور مہذب بھی ثابت کیا ہے، اس ضمن میں اردو شاعری خصوصاً غزل کی گوناگوں خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، اور اس کی دروں بینی، معنی آفرینی اور اس کے اعجاز و ایجاز کا کمال بھی دکھایا ہے، اردو زبان کے شہ پاروں اور اس کے ادیبوں اور شاعروں کو کمتر بنا کر پیش کرنے کی کلیم الدین صاحب کی کوششوں کا تحلیل و تجزیہ ہی نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مصنف نے جا بجا ان پر کوتاہ بینی، حقایق سے چشم پوشی، ان کی علمی تہی مایگی اور تنقیدی صلاحیت کے فقدان کا الزام بھی عائد کیا ہے، مثلاً کلیم الدین احمد کا انگریزی ادب میں کوئی مقام نہیں (ص ۱۱) حالی نے انگریزی زبان کی کتابوں کے ترجمہ سے جتنا کچھ حاصل کر لیا تھا، کلیم الدین انگریزی زبان کے پروفیسر ہو کر بھی حاصل نہ کر سکے (ص ۱۳) کلیم الدین احمد انگریزی ادب خاص کر اس کی رومانی شاعری کو چھوڑ کر دوسرے علوم و فنون سے قطعی واقف نہیں (ص ۲۵) وہ علم عمرانیات، علم نفسیات، علم جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ سیاسیات اور حکم علم لسانیات سے بالکل ناآشنا ہیں (ص ۲۵) وہ انسانی تہذیب و تمدن، قوموں کے عروج و زوال اور زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے اسباب اور اثرات سے بھی بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں، جبکہ ایک ناقد کو ان ساری باتوں کا علم ہونا چاہیے (ص ۲۵) ان کے اندر فہم و ادراک اور غور و فکر کی بھی کمی ہے، اور وہ انگریزی رومانی شاعری کے علاوہ دیگر علوم و فنون سے بھی قطعی واقف نہیں (ص ۶۳) انہوں نے بہا لسانی، تاریخی اور ادبی غلطیاں کی ہیں (ص ۶۹)

کلیم الدین احمد اپنی ذات اور سطحی بات سے بلند ہو کر کچھ نہیں سوچتے، اس لیے انہوں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں، لوگوں نے انہیں سنبھالنے کی کوشش بھی کی، مگر وہ گرنے ہی پر مصر رہے (ص ۱۱۳) انہوں نے اپنی تنقید کے لیے خود کوئی اصول وضع نہیں کیا، دوسرے ناقدین کے وضع کردہ اصولوں کو اپنی تنقید کے لیے بروئے کار لاتے ہیں (ص ۱۲) عربی، فارسی اور اردو زبان کے ناقدوں کے ذریعہ وضع کردہ اصولوں کی طرف سے چشم پوشی ہی نہیں کی ہے، بلکہ ان میں زبردستی کیڑے بھی نکالے ہیں (ص ۱۲) انگریزی اور فرانسیسی ناقدوں کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تنقید کی ہے (ص ۱۲) وہ مغربی ناقدین کے خوشہ چیں رہے بلکہ گلچیں بھی (ص ۱۳) وہ انگریزی شاعری ہی کو معیار شاعری سمجھتے ہیں (ص ۸۹) وہ اردو زبان کے بڑے ناقد نہیں (ص ۱۳) وہ تنقید کے بنیادی اصول سے بھی واقف نہیں (ص ۲) ان کے اندر ناقدانہ صلاحیتوں کا بھی فقدان ہے (ص ۸۹) ان کے اندر تنقیدی صلاحیت کا سخت فقدان ہے (ص ۱۱۶) کلیم الدین تنقیدی اصول جانتے ضرور ہیں مگر اس کی روح سے ناآشنا ہیں (ص ۱۴۹) کلیم الدین کا تنقیدی شعور اتنا بالیدہ اور ترقی یافتہ نہیں کہ وہ شاعری اور قافیہ پیمائی میں امتیاز کر سکے (ص ۱۱۲) حالی کلیم الدین کے مقابلہ میں تعمیری اور صالح تنقیدی شعور رکھتے تھے، انہیں نثر اور شعر کی پہچان کلیم الدین سے بہتر تھی (ص ۱۵۱) کلیم الدین کے یہاں تضاد کی کمی نہیں (ص ۱۴) انہوں نے سوائے اپنے والد عظیم الدین اور اپنی ذات کے کسی کو نہیں چھوڑا (ص ۲۱) وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہیں اس لیے غیر ذمہ دارانہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، (ص ۴۳) اردو شعراء پر ان کا تن آسانی کا الزام لگانا حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے، انہوں نے خود تن آسانی سے کام لیا، اور بغیر غور و فکر سے کام لیے ایک غلط بات کہہ دی (ص ۸۶) حالی کے متعلق کلیم الدین کا بدنام زمانہ جملہ خود کلیم الدین پر لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے کہ "خیالات ماخوذ،

واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط، یہ ہے کلیم الدین کی کائنات" (ص ۱۶) اور یہ سب محض دعوے نہیں ہیں، بلکہ پوری کتاب میں ان کی مفصل و مدلل وضاحت ہے، جناب تاج پیامی جغرافیہ کے لکچرر ہیں، مگر اردو شعر و ادب اور تنقید نگاری سے بھی ان کو دلچسپی ہے، اور انگریزی ادب پر بھی ان کی اچھی نظر ہے، انہیں اپنی بات کو مدلل طور پر منطقی انداز میں پیش کرنے کا اچھا سلیقہ بھی ہے، مگر پتہ نہیں کیوں انہوں نے اس کی بار بار معذرت کی ہے کہ یہ کتاب "میں نے کلیم الدین احمد کی مخالفت میں نہیں لکھی ہے، بلکہ اردو زبان، اس کے شعراء اور اسکی شاعری کی حمایت میں لکھی ہے" نتیجہ کے لحاظ سے دونوں باتیں تو یکساں ہی ہیں، بعض لفظوں کا املا غلط درج ہے، جیسے ہدی خوانی ص ۲۶ (حدی خوانی) اخترا ص ۲۳ (اختراع)، توجیح ص ۱۲۴ و ص ۱۳۱ (توجیہ) سلسلۂ نصب ص ۱۷ (سلسلۂ نسب) بزعم خود ص ۲۱۵ (بزعم خود) مندرجہ ذیل جملہ میں ہندی کا خط کشیدہ لفظ اردو میں بالکل نامانوس معلوم ہوتا ہے،

"ایک نہیں انیک مضامین باندھے ہیں،" کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے،

سفرنامۂ ہند:- مولانا محمد یوسف قریشی، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۱۶، قیمت پندرہ روپیے، پتہ:- موتمر المولفین، جامعہ اشرفیہ، پشاور، پاکستان،

مولانا محمد یوسف قریشی شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ اشرفیہ پشاور ۱۹۸۰ء میں دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان تشریف لائے تھے، یہ کتاب ان کے اسی سفر کی روداد ہے، اس میں اجلاس کی مختصر کارروائی بھی درج ہے، اور دار العلوم دیوبند کے قیام، اس کی عمارتوں، اس کے اصولِ ہشتگانہ اور اس کی صد سالہ خدمات کا مختصر خاکہ بھی دیا ہے، اور دار العلوم سے وابستہ مندرجہ ذیل حضرات کے حالات اور کارنامے بھی بیان

کیے ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حاجی سید محمد عابد صاحبؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا قاری محمد طیب اور مولانا اسعد مدنی، مصنف دیوبند کے علاوہ سہارنپور، گنگوہ، تھانہ بھون، میرٹھ، دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری بھی گیے، اور سب جگہوں کی قابل ذکر عمارتوں، باغوں، مسجدوں، مقبروں، قلعوں، صنعتوں اور وہاں کے مشاہیر کا مختصر تذکرہ بھی لکھا ہے، سہارنپور کے سفرنامہ میں مدرسہ مظاہر علوم، اس کی عمارتوں اور خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے حالات و خدمات قلمبند کیے ہیں، گنگوہ کے سلسلہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور تھانہ بھون کے ضمن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا ذکر کیا ہے، قابل دید عمارتوں کے عکس بھی دیئے گیے ہیں، اس طرح یہ سفرنامہ دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے، اس سے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ پاکستان میں ہندوستان سے زیادہ گرانی اور دفتروں میں بدعنوانی ہے،

سرگذشت آصف: مرتبہ پروفیسر ہارون الرشید صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰ مع رنگین جلد، قیمت ۱۲ روپے، ناشر:- مغربی بنگال اردو اکاڈمی ۱۷، سندری موہن ایونیو، کلکتہ ۱۴-۷۰۰۰،

رضا علی وحشت کے تلمیذ رشید جناب عبد الرحمن آصف بنارسی مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ کلکتہ میں بسر ہوا، آخر میں ڈھاکہ گیے اور وہیں ۱۹۶۷ء میں آسودہ خاک ہوتے، وہ بڑے پرگو، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، مگر گوشہ نشینی، طبعی بے نیازی اور نام و نمود سے بیزاری کی وجہ سے ان کو زیادہ شہرت نصیب ہوئی، اور نہ مجموعۂ کلام شایع ہوا، اب پروفیسر ہارون الرشید صاحب مقیم ڈھاکہ نے ان کی سرگذشت شایع کی ہے، اس میں انہوں نے ان کے حالات اور ان کی

سیرت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں کیے ہیں، اور ان کی شاعری پر تبصرہ کرکے اس کی خصوصیات بھی دکھائی ہیں، اس کے آخر میں آصف کے کلام کا ایک مختصر انتخاب بھی درج ہے، جو خود انہوں نے تحریر کرکے لائق مرتب کے حوالہ کیا تھا، یہ اٹھارہ غزلوں اور سات رباعی پر مشتمل ہے، آصف صاحب کا کلام طرز قدیم کا حامل ہے، اس لیے یہ موجودہ دور کی شاعری کی بے اعتدالی، ناہمواری اور ابتذال سے پاک ہے، اور اس میں زبان اور محاوروں کی صحت کا لحاظ کرنے کے علاوہ مضمون آفرینی بھی کی گئی ہے، اور یہ لطف و اثر سے بھی خالی نہیں ہے، مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے خدمت ادب کے جذبہ سے یہ سرگذشت شایع کی ہے جس کے لیے وہ قابل ستائش ہے، ص۲۵ پر دو جگہ ہاجرہ کو حاجرہ لکھا ہے، شاید یہ کتابت کی غلطی ہے،

محسوسات و معقولات: مرتبہ جناب حمد اللہ فراہی علیگ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۶۸، قیمت آٹھ روپے پچہتر پیسے پتے (۱) مسکین بکڈپو ایم ڈی روڈ جے پور (۲) ہجوم بکڈپو، ۱۳۳-A ذاکر نگر، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی،

حکیم ڈاکٹر حمد اللہ فراہی لکچرر راجستھان یونانی میڈیکل کالج جے پور ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے پوتے اور ذی صلاحیت نوجوان ہیں، انہوں نے طب یونانی کے فروغ، اسکی قدیم تحقیقات کو نئے انداز میں اردو اور انگریزی میں پیش کرنے، طلبہ کے کورس کیلئے معیاری طبی کتابوں اور ایک طبی جریدہ کی اشاعت کیلئے جے پور میں ایک سائنٹفک طبی ریسرچ سنٹر قائم کیا ہے، یہ کتاب سنٹرل کونسل انڈین میڈیسن کے تیار کردہ کورس کے مطابق پری طب کیلئے لکھی گئی ہے، اس میں حکمت و منطق کی اہمیت اور انکے مبادی و مصطلحات کی تعریف و توضیح مثالوں کے ذریعہ کی گئی ہے، اور چونکہ کتاب طب کے طلبہ کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے، اس لیے مثالیں بھی عموماً اسی کی دی گئی ہیں، یہ موضوع خشک ہے لیکن نوجوان مصنف نے اسکو تر بنانے کی کوشش بھی کی ہے، اور تفہیم کا جدید طریقہ اور دلنشین انداز اختیار کیا ہے، اور جدید اور انگریزی اصطلاحیں

بھی بالمقابل تحریر کردی ہیں، مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے، مگر اپنے موضوع پر اچھی، مفید اور طلبۂ فن کے مطالعہ کے لائق ہے، اس سے ان کے اچھے ذوق اور مباحث کو سمیٹ کر لکھنے کے بہتر انداز کا پتہ چلتا ہے،

اسلامی انقلاب، مخالف قوتیں اور مسلمان — مرتبہ جناب سید علی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، قیمت پانچ روپئے،

پتہ:- مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی،

اس کتاب میں اسلامی انقلاب کی موجودہ لہر اور اسکی مخالفت و مزاحمت کا جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں ایران کے انقلاب، پاکستان میں نظامِ مصطفیٰؐ کے عزم اور افغانستان میں مجاہدوں کی سرفروشی کا حال بیان کیا گیا ہے، ضمناً مصنف نے کئی مسلم ملکوں میں اسلامی تحریکوں اور مسلمانوں کی اسلام کی سربلندی کے لیے جد و جہد کا تذکرہ کیا ہے، اور یورپ کے ملکوں میں بھی مسلمانوں کی دینی بیداری کا ذکر کیا ہے، اور جن گوشوں سے اور جو عناصر اسلامی انقلاب میں رخنہ انداز بن رہے ہیں، انکی نشاندہی کی ہے، ایران کے جائزہ میں شاہ ایران کی بے تدبیری، اسلام دشمنی اور امریکہ نوازی وغیرہ کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجہ میں عوامی بیداری اور اسلامی تحریک بروئے کار آئی، انقلاب کے بعد کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ ہر انقلاب کی طرح اس انقلاب کے بعد بھی مسائل و مشکلات پیدا ہوئے جنکو حل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، مگر اسلام دشمن عناصر اس کے خلاف بے بنیاد پروپگنڈہ کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، پاکستان کے ذکر میں جناب ضیاء الحق سے قبل کے ابتر حالات اور انکی اسلام کو غالب کرنے کی مخلصانہ جد و جہد اور انکی راہ کی رکاوٹوں کا جائزہ لیا ہے، پھر افغانستان میں مجاہدین کی انقلابی سرگرمیوں اور روسی مظالم کا ذکر ہے، اسلامی انقلاب کے خلاف ہونیوالی سرگرمیوں اور خطرناک سازشوں کے سلسلہ میں کمیونزم، مغرب کے سامراجی نظام اور یہودی صہیونیت کا ذکر کیا ہے، ہندوستان کی جماعت اسلامی کی مخالفت میں کمیونسٹ اور بعض دوسری پارٹیوں کے طرزِ عمل اور انکی سازش کے شکار مسلمانوں کے رویے پر بھی بحث کی ہے، اور آخر میں بتایا ہے کہ اسلامی انقلاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیئے، یہ کتاب دلسوزی اور اسلام کی خیرخواہی کے جذبہ سے لکھی گئی ہے، مگر اسکا انداز بڑا جذباتی ہو گیا ہے،

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا انداز ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز سے بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت:- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"